نکہت حسن
عاقبت کا توشہ
کہانیاں

عاقبت کا توشہ

کہانیاں

نکہت حسن

عاقبت کا توشہ

(کہانیاں)

نکہت حسن

پہلی اشاعت: ۱۹۹۹

کتب خانہ پیپر بیک سیریز
زیرِ اہتمام: آج کی کتابیں

طباعت: فضلی سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ، اردو بازار، کراچی

سٹی پریس بک شاپ

316 مدینہ سٹی مال، عبداللہ ہارون روڈ، صدر، کراچی 74400
فون: 0623 565 (21-92)
ای میل: aaj@digicom.net.pk

ترتیب

سِدرۃ المنتہیٰ

چودہ تاریخ کو نصف شب کے قریب آسمان کی کھڑکی کھلتی ہے اور زمین پر نور کی بارش ہوتی ہے۔ نگاہیں چندھیا جاتی ہیں اور زبان گنگ ہو جاتی ہے۔ اُس وقت قضاوقدر کا فیصلہ ہوتا ہے۔ یہ حاجت روائیوں کا وقت ہے۔ دعاؤں کی قبولیت کا لمحہ۔ وقت کا وہ لمحہ جس کے متعلق زہرہ نے بچپن سے سن رکھا تھا اور جو بندوں کو شاذ ہی نصیب ہوتا ہے۔ ہاں، جو متقی پرہیز گار ہیں اُن کی جدا بات ہے۔ زہرہ نہ متقی تھی اور نہ پرہیز گار۔ وہ تو بہت مشکل سے ابھی سورۃ البقر کے دوسرے رکوع پر پہنچی تھی۔ رحل پر سرخ کارچوبی والے جزدان میں کلام پاک رکھا تھا۔ کلام پاک سے چند قدم کے فاصلے پر زہرہ اپنے دونوں ہاتھ گالوں پر رکھے ہوئے بیٹھی تھی اور سوچ رہی تھی کہ سال نہیں تو مہینے تو ضرور اس کو ختم ہونے میں لگیں گے۔ پھر نفس کی اصلاح، فرائض اور نوافل کی ادائیگی، حقوق اللہ اور حقوق العباد، ایسی ایسی اَور بہت سی باتیں جو سب زہرہ کی سمجھ سے باہر تھیں؛ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کے لیے ایسی ایسی ہزاروں سیڑھیاں تھیں۔ سخت مشکل راستہ تھا۔ زہرہ کے قدم ڈگمگائے جاتے تھے۔

استانی بندی خانم نے دِنوں زہرہ کو ایک ہی سبق پڑھایا تھا:

"یا فتّاحُ، مجھ بندی کا دل کھول واسطے علم کے۔" مگر زہرہ کے ذہن میں روز بروز قفل پڑتے گئے۔ سیپارے کے سارے حروف گڈمڈ ہوتے گئے۔ استانی بندی خانم کے بار بار ڈرانے دھمکانے کے باوجود الفاظ زہرہ کی زبان سے بڑی عجیب وغریب صورت اختیار کر کے نکلتے۔ اس کی زبان کی

لکنت اور اس کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے چارگی کو نظر انداز کر کے استانی جی اس کی کمر پر دھموکے لگاتیں اور پھر اپنی پُراثر آواز میں عذابِ الٰہی اور عذابِ قبر کا ایسا نقشہ کھینچتیں کہ زہرہ کی ڈر سے گھگھی بندھ جاتی۔ وہ بل بل کر پڑھنا شروع کر دیتی:

"یا فتاحُ، مجھ بندی کا دل کھول واسطے علم کے۔"

مگر جوں جوں وہ ذہن کھلنے کی دہائی دیتی، ذہن پٹ ہوتا جاتا۔ آخر استانی بندی خانم مہینے کے اندر اندر اس پر کند ذہنی کا الزام لگا کر بری الذمہ ہو گئیں۔ حافظ نابینا سے پڑھنے سے زہرہ نے خود انکار کر دیا۔ لے دے کے اب مولوی نورالدین کا مکتب تھا، جہاں لڑکے لڑکیاں ساتھ ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔ مولوی صاحب روحانیت کے پیرو ایک درویش صفت بزرگ تھے۔ دنیا ان کی نظر میں ہیچ تھی۔ وہ روح کی اصلاح کے قائل تھے۔ مکتب میں بچوں کی تعلیم کا آغاز اُس سوال نامے سے ہوتا تھا جو مُردے اور منکر نکیر کے درمیان ہونا تھا اور جو قسامِ ازل نے بقول مولوی نورالدین ابتدائے آفرینش سے لوحِ جہاں پر رقم کر دیا تھا۔ سوال نامہ حفظ کرنے کے بعد بچے کی تعلیم شروع ہوتی تھی۔ جو بچہ جلدی سوال نامہ حفظ کر لیتا تھا، اس کے پرہیز گار ہونے کی بشارت مولوی صاحب دے دیا کرتے تھے۔ پھر اس کے لیے مکتب کے تمام مدارج سہل ہو جاتے تھے۔ حیدر مولوی نورالدین کے مکتب کا سب سے زیادہ ذہین شاگرد تھا، جس کے متعلق مکتب میں آنے سے پہلے زہرہ نے سن رکھا تھا کہ اس نے اپنی آنکھوں سے آسمان سے نور کی بارش ہوتے ہوئے دیکھی ہے۔ دراصل حیدر کو پورا سوال نامہ حفظ تھا اور اب مکتب میں حیدر ہی اس کی گردان دوسرے بچوں کو کرواتا تھا۔ وہ سر پر اپنی ٹوپی کو جماتا، آنکھوں کو آدھا کھولتا اور پھر بالکل مولوی صاحب کی طرح حلق سے آواز نکال کر پوچھتا:

"بول، بندہ کس کا ہے؟"

"اللہ کا!" سب بچے جواب دیتے۔

"مذہب؟" وہ دوسرا سوال پوچھتا۔

"اسلام،" بچے جھوم جھوم کر کہتے۔

"ایمان؟"

"قرآن میرا ایمان،" بچے گلے کی نسیں پھلاتے اور عقیدت سے آنکھیں بند کر لیتے۔
"مکان؟"
"قبر میرا مکان،" بچوں کی آواز میں ہلکا ہلکا ارتعاش سا پیدا ہوتا اور پھیلتی ہوئی آوازیں سمٹنے لگتیں۔
"بندہ؟" حیدر کھڑا ہو جاتا اور ہاتھ فضا میں بلند کر کے پوچھتا۔ سب بچے ایک ساتھ سینے پر ہاتھ مار کر کہتے:
"میں بندہ مسلمان۔"
مولوی نورالدین کے مکتب میں زہرہ کو دوسرا دن تھا۔ ابھی سوالوں کی صحیح ترتیب بھی اس کے ذہن میں نہیں بیٹھی تھی۔ وہ ہر وقت ذہن میں سوالوں کو دہراتی رہتی، پر ذہن کا کیا کرے جو ٹھکانے پر آتا ہی نہیں تھا اور سوال و جواب سب گڈمڈ ہو جاتے۔ حیدر کے بار بار پوچھنے پر بھی وہ ایمان کی جگہ قبر اور بندہ مسلمان کی جگہ ایمان کہہ جاتی تھی، اس لیے حیدر نے اس کے دوزخی ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ زہرہ کو اپنی ساری پسلیاں ٹوٹتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ اس کا دَم گھٹنے لگا جیسے اس کی قبر سکڑ رہی ہو اور منکر نکیر اپنی خونی آنکھیں لیے اس کا گلا دبوچنے کو کھڑے ہوں۔ اس کی آنکھیں اُبل پڑیں اور اس کو ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ گھر والوں کا کہنا تھا کہ اس کو ایسے دورے شروع سے پڑتے ہیں؛ یوں ہی بیٹھے بیٹھے بتیسی بند ہو جاتی ہے، آنکھیں چڑھ جاتی ہیں اور ہاتھ پیر اکڑ کر لکڑی کی طرح ہو جاتے ہیں۔ یہ مرگی کے دورے ہیں، بہتیروں کا خیال تھا۔ عرصے تک زہرہ کے سر پر بھوبل میں دبی ہوئی جوتیاں برسائی گئیں۔ مانگ پٹی، تیل پھلیل، زیور کپڑے، پھول اور خوشبو سب سے پرہیز۔ سورج غروب ہونے کے بعد نہ وہ نہا سکتی تھی اور نہ کھلے بال لیے کوٹھے پر جا سکتی تھی۔ اجاڑ صورت اور اندیشوں سے بھرا دل لیے وہ یوں ہی اپنے گھر میں بھٹکتی رہتی۔ گھنٹوں آنکھیں بند کیے پڑی رہتی اور اس کو محسوس ہوتا کہ وہ بہت اونچے اونچے جا کر واپس آئی ہے، ساتویں آسمان پر بیر کے درخت کے پاس، جہاں نہ مولوی نورالدین ہیں نہ حیدر، نہ استانی بندی خانم اور نہ حافظ نابینا؛ بس ہلکے ہلکے پروں والے فرشتے ہیں جو نہ ڈراتے ہیں اور نہ دھمکاتے ہیں، بس بیر کے پیڑ پر جھولا سا جھولتے رہتے ہیں۔ تنہا یہ خیال زہرہ کے لیے انتہائی دل خوش کن

تھا- وہ پہروں آنکھیں بند کیے ساتویں آسمان کے تصور میں پڑی رہتی- آنکھیں کھولتی تو چاروں طرف پھیلا ہوا خوف اس کا گلا دبوچ کر کھڑا ہو جاتا اور وہ پھر آنکھیں بند کر لیتی- ساتویں آسمان تک پہنچنے کے لیے کڑی ریاضت کی ضرورت تھی، جو ریاضت چودہ شعبان کی نصف شب کو کی جاتی ہے، جب دیوار پر پھیلے ہوے سائے پھیلتے ہیں، سکڑتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سے سر سایوں سے جدا ہو جاتے ہیں- چودہ تاریخ کو سائے سے سر کا جدا ہونا موت کی علامت ہے- زہرہ کے باپ کی موت ایسے ہی ہوئی تھی...

شعبان کی چودہ تاریخ تھی- عنایت اللہ بہشتی نے صبح سویرے آ کر صحن اور کمروں کو دھو ڈالا تھا- دن نکلنے پر زہرہ کی ماں نے مٹی کی سکوریوں میں لوبان ڈال کر رکھ دیا- میٹھی قبولی کے لیے دال بھگوئی، چاول بھگئے اور کشمش اور چھوارے دھو کر حلوے کے لیے دیگچہ صاف کرنے لگیں- سخت چاشنی کا سوجی کا قتلی والا حلوہ، میٹھی قبولی اور میدے کی خستہ پوریاں- پندرہ تاریخ کو مردوں کی نیاز دلوانی تھی- سوچ رہی تھیں کہ سورج ڈھلنے سے پہلے سب کام کر لیں، پھر دعا درود بھی کرنا تھا- یہ رات جو سال میں ایک مرتبہ آتی ہے، دعاؤں کی قبولیت کی رات ــــ رزق کی کشادگی، درازیِ عمر اور اعمال کی سلامتی کے لیے ہزاروں دعائیں انھیں کرنی تھیں- زہرہ کے باپ ازلی مریض تھے- دمے کا جان لیوا مرض اور رعشہ- نصف شب کے قریب وہ پلنگ سے اٹھے- وضو کے لیے لوٹے میں پانی بھرا- آسمان پر چودہ تاریخ کا چاند نکلا ہوا تھا- دیوار پر سائے پھیل اور سکڑ رہے تھے- مسجد سے دعا درود کی آوازیں آ رہی تھیں- جلال و جمال والی رات تھی، جب ساتویں آسمان کی کھڑکی کھلتی ہے- زہرہ کی ماں نماز کی چوکی پر بیٹھی تھی- زہرہ دبکی ہوئی پلنگ پر پڑی تھی اور رضائی کے اندر منھ کیے آہستہ آہستہ کچھ پڑھ رہی تھی- اپنے باپ کے پیروں کی آہٹ پر اس نے رضائی سے منھ نکالا- روشن رات کا سحر اس کے پورے وجود پر چھایا ہوا تھا- اس نے آدھی کھلی آنکھوں سے دیوار کو ٹٹولا اور پھر فوراً اپنا چہرہ رضائی کے اندر چھپا لیا- زہرہ کی ماں نے نماز کی چوکی سے گردن موڑ کر دیکھا- زہرہ کی رضائی کے اندر کوئی چیز زور زور سے پھدک رہی تھی- تھوڑی دیر بعد اس کی بتیسی بند ہو گئی اور ہاتھ پیر لکڑی کی طرح اکڑ گئے- اسی لمحے غسل خانے سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی- زہرہ کے باپ غسل خانے کے فرش پر اوندھے پڑے تھے- ناک سے خون بہہ رہا تھا

اور سانس اکھڑ چکا تھا۔ اس کے باپ کی موت اُسی نصف شب کے قریب ہوئی تھی۔ زہرہ نے اپنی آنکھ سے دیوار پر سایہ ابھرتا ہوا دیکھا تھا۔ بغیر سر والا ایک لمبا چوڑا سایہ...

باپ کی موت نے زہرہ سے وہ لطیف اور خوشگوار تصور بھی چھین لیا جس کی آس میں اس نے بہت سے راتیں جاگ جاگ کر گزاری تھیں ـــــ آسمانی کھڑکی کھلنے کا پُراسرار تصور۔ ابا کی موت کے بعد سے زہرہ کے گھر کبھی وہ رات نہیں آئی۔ اب نہ چودہ شعبان کو گھر دُھلتا تھا نہ میٹھی قبولی کے لیے دال بھگوئی جاتی تھی۔ اماں کو اب نہ درازیِ عمر کے لیے دعائیں مانگنی تھیں اور نہ رزق کی کشادگی کی۔ پر زہرہ کے دل میں سینکڑوں خدشے تھے اور اس کو سینکڑوں دعائیں کرنی تھیں۔ وہ راتوں کو اٹھ جاتی۔ بھاری بھاری آنکھیں اور اندیشوں سے بھرا دل لیے وہ پوری رات جاگ کر گزار دیتی۔ دیواروں کو ٹٹولتی، بغیر سر والے انسانی سایوں کی تلاش میں، پر دیوار پر کسی کا سایہ نہ اُبھرتا۔ صبح مکتب میں جاتی تو مولوی صاحب کچھ اَور بڑے اور ڈراؤنے دکھائی دیتے اور حیدر اَور زیادہ تن کر کھڑا ہو جاتا جو روز کسی نہ کسی کے دوزخی ہونے کا فتویٰ دیتا رہتا تھا۔ کسی کی قبر سکیڑ کر اتنی تنگ کر دیتا کہ زہرہ اس کی انگلی اور انگوٹھے کے درمیان بنے ہوئے حلقے کو دیکھ کر چیخ پڑتی۔ اس کی بتیسی بند ہونے لگتی اور ہاتھ پیر اکڑنے لگتے۔ وہ اپنی ماں کی خوشامد کرتی کہ وہ مکتب میں نہیں جائے گی۔ وہ حافظ نابینا سے پڑھ لے گی۔ تب مولوی صاحب کو گھر پر بلایا جاتا۔ پردے کے پیچھے اس کی ماں مولوی صاحب سے بات کرتی۔

"مولوی صاحب اس کے بکل اتار دیجیے۔" ماں اس کو دھکیل کر مولوی صاحب کے سپرد کر دیتی۔ وہ پھر سہمی ہوئی سی مکتب میں آ کر بیٹھ جاتی جہاں آوازوں کا ارتعاش تھا اور زندگی کا فقدان اور جہاں چھوٹے چھوٹے ذہن قبر کے اندھیروں میں بھٹک رہے تھے اور جہاں منکر نکیر تھے اور ان کے تابڑتوڑ سوال۔

"قبر کا اندھیرا اور سوالوں کا سلسلہ۔ توبہ توبہ! ایسے تابڑتوڑ سوال کرتے ہیں، اور جو ذرا سی بھی چوک ہوئی تو بس سمجھ لو خیر نہیں۔" حیدر سوال نامے کی گردان کروانے سے پہلے چھوٹا وعظ ضرور دیتا تھا۔

"ہڈیاں ایسے چرچرائیں گی جیسے سوکھی لکڑیاں۔ آنتیں اُبل کر باہر آ پڑیں گی اور سانپ بچھو

ڈنک مار مار کر کلیجہ کھا جائیں گے۔ درود پڑھو!" وہ بچوں کو للکارتا۔ بچے اپنی ٹوپیاں اور ڈوپٹیاں سروں پر جما کر عقیدت سے درود پڑھنے لگتے۔

"اور جو کوئی جواب بھول گئے؟" درود پڑھتے پڑھتے سوال زہرہ کی زبان سے پھسل پڑا۔

"وہاں بھول چوک کی معافی نہیں ہے۔ بھولے تو پھر سمجھ لو!" وہ انگوٹھے اور انگلی کا حلقہ بناتا اور پھر اس کو تنگ کرتا۔ تنگ اور تنگ... اتنا کہ زہرہ کا دم گھٹنے لگتا۔ اس کا دل چاہتا وہ کسی غیر مرئی طاقت کے اثر سے یوں ہی بیٹھے بیٹھے اوپر اٹھی چلی جائے جیسے حضرت عیسیٰ اٹھے چلے گئے تھے، ساتویں آسمان پر۔ پر اس کے لیے کڑی ریاضت کی ضرورت تھی۔ پورا محلّہ اس ریاضت میں لگا ہوا تھا۔ بڑا کٹھن راستہ تھا جس کو فیرنی کے پیالوں، زردے اور پلاؤ کی پلیٹوں اور اگربتی لوبان کے بھبکوں سے طے کرنے کی کوشش میں ہر فرد لگا ہوا تھا۔ گھر سے لے کر مسجد اور مسجد سے لے کر مکتب تک ایک لائن سی لگی رہتی جو کسی صورت ٹوٹنے میں نہیں آتی تھی۔ ننھے بچے سروں پر چھوٹے بڑے خوان اٹھائے، کروشیا سے بنے ہوئے خوان پوشوں سے ڈھکے ہوئے فیرنی کے کورے کورے پیالے، چاندی کے ورق سے جھم جھم کرتی حلوے کی قتلیاں، زعفرانی سویّاں اور پستے بادام کی ہوائیاں پڑا ہوا اصلی کیوڑے کا شربت ـــــ یہ سب اُس مقام پر پہنچنے کے لیے چھوٹی بڑی سیڑھیاں تھیں جہاں بیر کا صرف ایک درخت ہے۔ یہ قبر کی کشادگی کے لیے چھوٹے بڑے جتن تھے اور یہ منکر نکیر کے سوالوں کے صحیح جواب دینے کے لیے ضروری انتظامات تھے جو سب کو کرنے تھے۔ تب زہرہ کو اپنی ماں پر غصّہ آتا جنھوں نے ابا کی موت کے بعد سے ہر طرف سے دھیان ہٹا لیا تھا۔ انھیں نہ قبر کی تنگی کی فکر تھی اور نہ منکر نکیر کے سوالوں کی۔ وہ تو اس راستے سے بھی خوف زدہ نہیں تھیں جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے۔

گناہوں کی بھاری گٹھری اٹھائے یہ اماں دھم سے گر پڑیں گی۔ یہ دوزخ کا ایندھن بنیں گی۔ ان کی قبر میں کیڑے کلبلائیں گے اور منکر نکیر سوال پوچھ پوچھ کر کلیجہ چھلنی کر دیں گے، اور یہ یوں ہی گم سم آنکھیں پھاڑے اور منہ کھولے بیٹھی رہیں گی۔ اسی طرح بے تعلق سی جیسی چودھویں شب کو بیٹھی رہتی ہیں، کہ نہ آسمان کو دیکھتی ہیں اور نہ زمین کو اور نہ دیوار پر پھیلے ان سایوں کو جن کے سر کندھوں سے جدا ہوتے ہیں۔ بس گم سم بیٹھی رہتی ہیں اور یوں ہی بیٹھی

بیٹھی سو جاتی ہیں۔ ان کی بلا سے کھڑکی کھلے یا نہ کھلے، زمین پر انوار کی بارش ہو یا نہ ہو، قسامِ ازل قضاوقدر کا فیصلہ کرے یا نہ کرے، لوحِ جہاں پر رزق کی کشادگی کا دفتر رقم ہو یا نہ ہو۔ وہ تخت پر اوندھ جاتیں اور پھر ایسے کھلے کھلے سانس اور دھیمے دھیمے خراٹے لیتیں کہ زہرہ سب کچھ بھول کر گھنٹوں ان کو تکا کرتی۔

اماں ابا کی موت سے پہلے کہاں تھیں اور اب کہاں ہیں؟ وہ سارے خدشے جو اماں کے ذہن میں دھند کی طرح چھائے ہوئے تھے ابا کی موت سے لمحے بھر میں چھٹ گئے تھے۔ ماں کا یہی سکون زہرہ کے لیے سب سے بڑا ڈراوا بن گیا تھا۔ اس کے ذہن میں ہر وقت کھدبد ہوتی رہتی۔ ادھورے خیالات اور بے بنیاد خوف رات دن اس کے ذہن پر چھائے رہتے۔ مولوی نورالدین کے مکتب اور اس میں حفظ کرائے جانے والے سوال نامے نے بھی اس کی کوئی مدد نہیں کی کیوں کہ زہرہ دراصل ایک کندذہن لڑکی تھی اور اس کے گھر کا المیہ یہ تھا کہ اس کا باپ مرچکا تھا اور اس کی ماں اس سے بے تعلق سی ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ تو زہرہ کے جسم پر ابھرتی ہوئی دلکش گولائیوں سے بھی بے خبر رہتی اور اس کو یوں ہی لڑکوں کے ساتھ مکتب میں پڑھنے بھیجتی رہتی اگر زہرہ کے چچا اس کا دھیان اس طرف نہ دلاتے۔

حاجی فیض الٰہی، زہرہ کے چچا ایک مذہبی پرہیزگار بزرگ تھے جنھوں نے لوگوں کو سچا مسلمان بنانے کی ذمے داری اپنے اوپر لے لی تھی۔ زہرہ بے چاری ایک لڑکی تھی اور وہ بھی حاجی فیض الٰہی کی بھتیجی؛ آخر وہ ان سے کس طرح بچ سکتی تھی! مکتب چھوڑنے کے بعد اس پر ہر چہار طرف سے یلغار شروع ہو گئی۔ صبح تڑکے اذان کے ساتھ ساتھ زہرہ کو اٹھا دیا جاتا۔ سیپارہ پڑھتے پڑھتے اس پر خوب مار پڑتی۔ سیپارہ پڑھاتے وقت اماں پوری جلاّدنی بن جاتیں۔ پتھریلی آنکھیں اور سخت چہرہ لیے سڑاسڑ مارا کرتیں۔ دوپہر کو چچی نماز یاد کرواتیں۔ آیت الکرسی اور دعاے قنوت کا ورد کرتے کرتے زہرہ کی زبان لڑکھڑانے لگتی۔ چچی ہر غلطی پر ایسی چٹکی بھرتیں کہ زہرہ تڑپ اٹھتی۔ شام کو مغرب کے بعد حاجی فیض الٰہی کے درس و تدریس کا سلسلہ شروع ہو جاتا۔ اولیاء اللہ کے کشف و کرامات کے تذکرے کہ کیسے فلاں بزرگ جنگل میں جا رہے تھے کہ ہرن نے ان کا پیچھا کیا اور پھر ہرن بڑھتا گیا، بڑھتا گیا۔ اپنی پچھلی ٹانگوں سے جو بڑھنا شروع ہوا تو میلوں تک پھیل

گیا۔ تب انھوں نے دعاے گنج العرش کا ورد کیا اور اس بلاے ناگہانی سے چھٹکارا حاصل کیا۔ یا اس بوٹی کا ذکر جو حاجی فیض الٰہی کے باپ کو کسی بزرگ نے دی تھی اور جس کو کھا کر وہ سوا سو سال زندہ رہے تھے۔ منھ میں بتیسوں دانت تھے، بینائی میں مطلق فرق نہیں آیا تھا، ہاتھ پیر سب اپنی جگہ ٹھیک ٹھاک تھے۔ آنکھیں بند کیے مراقبے میں بیٹھے تھے۔ دروازے پر ایک سبز پوش آیا۔ نہ فریادی تھا اور نہ سائل؛ کھڑا دروازے کو تکتا رہا۔ جاتے جاتے اس نے نوکر سے کہا کہ گھر کا مینار ہل رہا ہے، اور صبح کو فیض الٰہی کے باپ نماز کی چوکی پر بیٹھے بیٹھے ختم ہو گئے۔ کمرہ روشنی سے بھرا ہوا تھا۔ سب ان کے کمرے کی طرف دوڑے، پر وہ تو برق تھی جو چمکی اور ختم۔

زہرہ آنکھیں پھاڑے اور ہونٹ سکوڑے یہ سب باتیں سنا کرتی۔ اس کی سمجھ میں خاک نہ آتا۔ کیوں داداجان بیٹھے بیٹھے ختم ہو گئے؟ کیوں روشنی سے کمرہ بھر گیا؟ اور پھر کیوں وہ روشنی غائب ہو گئی؟ یہ سب گورکھ دھندا تھا جس میں زہرہ کا ذہن ہر وقت الجھا کرتا۔ چچا فیض الٰہی کے درس و تدریس نے اس کو اور بھی حواس باختہ سا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس کا اپنا گھر اس کے لیے روز بروز پُراسرار ہوتا جا رہا تھا، کسی پرانی خانقاہ کی طرح پُراسرار اور ڈراؤنا، اور اس میں بہت سے سہمے سہمے انسانی ہیولے، جٹادھاری فقیر، بوڑھی کھوسٹ عورتیں اور آگے دوڑتے ہوے سیپارے کے سیاہ حروف، جن پر نظریں جماتے جماتے زہرہ کا سر چکرانے لگتا۔ فردوس اور اس کی چھوٹی بہن نوروز جھٹاجھٹ سیپارے کے بعد سیپارہ ختم کر رہی تھیں۔ صبح سویرے وہ بستہ بغل میں دبا کر زہرہ کی ماں کے پاس پڑھنے آ جاتیں۔ گھر کے چھوٹے موٹے کاموں میں اس کا ماں کا ہاتھ بٹاتیں، مسالا پیستیں، برتن اٹھا اٹھا کر الماری میں رکھتیں، صحن میں جھاڑو لگاتیں اور پھر دوپٹوں سے سر ڈھانک کر سورۂ فاتحہ سے جو آموختہ پڑھنا شروع کرتیں تو پندرہ بیس منٹ میں اپنے سبق پر آ جاتیں۔ پھر آوازیں ایسی سریلی کہ پڑھتیں تو دور پرے کا آدمی بھی لمحے بھر کو ٹھہر جاتا۔

"اصل میں دل کی بات ہے۔ بچیوں کے دل نورِ ایمان سے منور ہیں،" چچا فیض الٰہی نے ایک دن ان کی آواز پر جھومتے ہوے کہا تھا اور پھر زہرہ سے سیپارہ منگوا کر سنا۔

سیقول السفہاء من الناس پڑھنے کے بعد زہرہ کا حلق بند ہو گیا۔

"اری پڑھ نا!" اس کی ماں نے کہنی اس کی کمر میں گاڑتے ہوئے کہا۔ زہرہ گم متحان منہ تھتھائے بیٹھی رہی۔ ماں نے پھر ٹھوکا مارا۔ "یہ تو آموختہ ہے!" زہرہ نے پڑھنے کی کوشش کی اور پھر آواز حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی۔

اس میں زہرہ کا قصور نہیں تھا۔ وہ بڑے شوق سے سیپارہ پڑھتی۔ بالکل فردوس کی طرح خوش الحانی سے سیپارہ پڑھنے کا اس کو خود بہت شوق تھا۔ لیکن وہ کیا کرے، وہ جوں ہی سیپارہ کھولتی، ذہن قلابازیاں سی کھانے لگتا۔ سیپارہ اور اس کے سارے حروف آہستہ آہستہ غائب ہو جاتے۔ اس کے سامنے مولوی نورالدین کا مکتب ہوتا، حیدر ہوتا، قبر کی تنگی اور منکر نکیر۔ یا پھر لمبی ٹانگوں والا ابرن، سبز پوش سوار، سیاہ بلّی جو جِن ہوتی ہے اور جو الناس والی سورت پڑھنے سے غائب ہو جاتی ہے۔ یا پھر چودہ شعبان کی نصف شب اور دیوار پر پھیلے ہوئے بغیر سر والے سائے، حلوے اور میٹھی قبولی سے ڈھکے ہوئے خوان یا جلال و جمال والی رات جو ابّا کی موت کے بعد سے زہرہ کے گھر کبھی نہیں آئی، کیوں کہ گھر میں اب چچا فیض الٰہی کا حکم چلتا تھا اور چچا نذر نیاز اور فاتحہ درود کے سخت خلاف تھے۔ چہرے پر چھاج برابر ڈاڑھی لگائے واہی تباہی بکا کرتے۔ زہرہ کو ان کی باتوں پر کم ہی یقین آتا تھا، کیوں کہ زہرہ نے چچا کو خود کبھی کلامِ پاک یا نماز پڑھتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ پھر بھی جانے کیا بات تھی کہ چچا پورے محلّے میں پوجے جاتے تھے۔ کسی کا بچہ بیمار ہو گیا، چچا کے پاس دوڑا دوڑا آ رہا ہے۔ کسی بڑے کو زہریلے کیڑے نے کاٹ لیا، وہ گھسٹتا ہوا چلا آ رہا ہے۔ عورتیں ہیں تو وہ تعویذ گنڈے مانگ رہی ہیں۔ وبا پھیلی تو محلّے کا محلّہ گھر میں ڈھل آیا۔ سیاہ ڈوریوں کے گنڈے بننے شروع ہو گئے۔ اماں، چچی، بھابی سب تخت پر بیٹھ گئیں۔ منہ سے پڑھ رہی ہیں اور ہاتھ سے سیاہ ڈوریوں میں گرہیں لگاتی جا رہی ہیں۔ بچوں کو لائن سے کھڑا کیا اور منہ سے چھو چھو کر گنڈے گلے میں ڈال دیے۔ وبا ٹل گئی پر گنڈے گلوں میں پڑے ہیں۔ بڑھوار کا زمانہ، گردنوں میں زخم پڑے جا رہے ہیں، پر گنڈا اب اترتا ہے نہ جب۔ گنڈا اُس وقت اترتا جب چچا پر جذب کی کیفیت طاری ہوتی اور وہ کہتے:

"گنڈے بڑھا دو۔ سوا تین گز زمین کھود کر اس میں دفن کر دو۔" پھر گھر میں ایک تقریب ہوتی۔ آبِ زم زم کی بوتلیں زمین پر لنڈھا کر اگر اور لوبان کی دھونی میں سوا تین گز زمین کھودی

جاتی۔ چچا اس سرنگ کے اندر اترے چلے جاتے اور زہرہ کا دل چاہتا وہ زمین پر پڑی ہوئی ساری مٹی اٹھا کر اس سرنگ کا منہ پاٹ دے۔ چچا تو موذی وبا سے بدتر تھے۔ وبا کو دعا اور درود اور تعویذ گنڈوں سے ٹالا جا سکتا تھا، اور ٹالا جاتا ہی رہتا تھا؛ پر یہ چچا سانپ کے منہ کے چھچھوندر تھے۔ صبح سویرے اٹھ جاتے۔ چھڑی زمین پر مارتے۔ کیا بچے اور کیا بڑے، سب بستروں سے اژدہے کی طرح بل کھا کر نکل پڑتے اور پھر کونے کونے سے آوازیں آنے لگتیں۔ دلان سے اماں کی کپکپاتی ہوئی آواز اُبھرتی اور پورے صحن میں پھیل جاتی۔

تو ہی اکبری اور تو ہی سروری
میری بار کیوں دیر اتنی کری

کمرے سے چچا اللہ ہو کے نعرے لگاتے اور بچی پڑھتیں:

"نزع میں راہ زن نہ ہو شیطان۔ نام حضرت کا لے کے دے دوں جان۔" بھابی سورۂ یٰسین کا ورد کرتیں اور بچے برابر بیٹھے ہوئے آمین آمین کہتے جاتے۔ عجیب سماں ہوتا۔ ہر شخص زندگی سے بے زار کونے میں منہ دیے موت کی دہائی دیتا رہتا۔ چچا ہاتھ میں چھڑی لیے پورے گھر میں گھومتے رہتے اور جب ان کو یقین ہو جاتا کہ گھر کا ہر فرد بیدار ہو کر اپنی موت سے آگاہ ہو چکا ہے، تب بھی وہ بے یقینی سے گردن ہلاتے اور گنگناتے ہوئے سڑک پر نکل جاتے:

آگاہ اپنی موت سے کوئی بشر نہیں
سامان سو برس کا ہے پل کی خبر نہیں

پھر جیسے ہی سورج نکلتا چچا کو گویا سانپ سونگھ جاتا۔ وہ آنکھیں بند کر کے پلنگ پر پڑ جاتے۔ نہ کھانا نہ پینا۔ زہرہ سوچتی کسی دن وہ یوں ہی پڑے پڑے ختم ہو جائیں گے، اور اچھا ہی ہے ختم ہو جائیں۔ وہ پورے گھر میں آسیب کی طرح چھا کر جو رہ گئے تھے۔ زہرہ کا اکثر یہ دل چاہتا کہ وہ اس گھر سے بھاگ جائے یا رات کے اندھیرے میں کوئی غیبی طاقت ہاتھ بڑھا کر اس کو یوں ہی اٹھا لے۔ اس سے یہ سیڑھیاں نہیں چڑھی جائیں گی ــــ ہول اور اندیشوں سے پٹی ہوئی سیڑھیاں، ہیچ دار اور بل کھاتے زینے، ٹیڑھی میڑھی پگ ڈنڈیاں۔ ساتویں آسمان تک پہنچنے کے لیے راستے اس قدر ناہموار اور اونڈلے سونڈلے تھے کہ زہرہ چلنے کی کوشش کرتی تو پھسل کر نیچے آ جاتی، لڑھکتی

ہوئی، جیسے بہت بلندی سے پھینکی گئی ہو۔ اکثر رات کو سوتے وقت اس نے دھماکا سنا تھا اور خود کو بہت بلندی سے گرتا ہوا پایا تھا۔ اُس وقت اس کی آنکھ کھل جاتی۔ خوف پھیل کر اس کے پورے وجود پر چھا جاتا اور وہ بوکھلا کر پلنگ سے کھڑی ہو جاتی اور اپنی ماں کے پلنگ کے پاس گھگھیانے لگتی:

"امّی امی، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

"درود شریف پڑھو اور سو جاؤ۔" ماں کروٹ بدل کر لیٹ جاتی۔

"امّی درود شریف!" اس کی آواز کانپتی۔

"ہاں ہاں، کہا تو درود شریف پڑھو!" ماں نیند میں بڑبڑاتی اور زہرہ پھر پلنگ پر آ کر لیٹ جاتی۔ ایسے میں چچا کے پلنگ پر کوئی چیز کانپتی، خراٹوں کی آواز اللہ ہو اللہ ہو میں تبدیل ہو جاتی۔ زہرہ نے بیسیوں مرتبہ یہ آوازیں سنی تھیں۔ کبھی گم سم بیٹھے ہیں تو اژدہا سا سامنے کھڑا ہو جاتا۔ اوندھے پڑے ہیں تو سڑسڑ کوڑے کمر پر لگنے لگتے۔ بہتیری مرتبہ ان کے سرہانے سے چاقو کے پھل، لوہے کے پترے اور لمبی دھار والی چھریاں نکلی تھیں۔ یہ ہی سب باتیں تھیں جن کی وجہ سے گھر تو گھر پورا محلّہ چچا کا معتقد تھا۔ یہ تو زہرہ ہی کی عقل پر پتھر پڑے تھے جو ایک دن بیٹھے بٹھائے ان سے اڑ گئی۔ یوں ہی کھلے سر اور کھلے منہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے جا رہی تھی۔ ماں نے بہتیرا کہا کہ چادر اوڑھ لے، برقع سر پر ڈال لے۔ کوئی ایسی بچی تھوڑی تھی۔ خیر سے گیارھویں برس میں تھی۔ اتنی عمر کی بچیاں پہلے زمانے میں دو دو بچوں کی مائیں ہوتی تھیں۔ زہرہ کی ماں ایسی کون سی بڑی تھیں۔ یہ تو پے در پے صدموں اور میاں کی موت نے ان کو وقت سے پہلے بوڑھا کر کے رکھ دیا تھا۔ سارے حوصلے اور اُمنگیں یوں ہی ختم ہو گئیں۔ اب تو بس دالان میں بیٹھی خدا سے اپنی باری کی شکایت کیا کرتیں۔

بچی پر ازل سے زندگی کے سب دروازے بند تھے۔ باپ صوفی اور میاں مجذوب۔ بھابی بیاہ کر آئیں تو اور ہی ہَولاخبطا۔ ذرا ذرا بات کا وہم۔ یوں کیا تو یہ ہو جائے گا، ووں کیا تو آسمان گر پڑے گا۔ ایسے چلیں تو زمین پھٹ جائے گی۔ شام کو نہائیں تو پیپل کے جن بھوت نکل کر سینے پر سوار ہو جائیں گے۔ عطر کی شیشی کھولی ہی تھی کہ جن برآمد ہوا۔ رات دن سرخ مرچوں کی دھونی

دے دے کر چوکھٹ پر سے بدروحوں کو بھگایا کرتیں، مگر روحیں گھوم پھر کر وہیں پلٹ آتیں۔ ہر سال سوا سال کے بعد بھابی کے ہاں بچہ پیدا ہوتا، انتہائی گھناؤنا اور کریہہ المنظر۔ شاہ دولہ کے چوہے سے سارے گھر میں رینگتے پھرتے۔ گھر ایک خوفناک ہیولے کی طرح زہرہ کے اعصاب پر سوار ہو کر رہ گیا تھا، جہاں موت کی دبائی تھی اور قبر کا اندھیرا۔ زہرہ کا دل چاہتا کہ وہ بھاگ جائے اور کہیں دور جا کر بہت زور سے چیخے۔ ایک ایسی چیخ جو آسمان کے ساتوں پردوں کو چیر دے اور تب آسمان کی کھڑکی کھلے اور یہ تمام گھٹن لمحے بھر کے لیے ہی دور ہو جائے۔ اس لمحے کے انتظار میں زہرہ نے بہتیری راتیں چچا سے چھپ کر اور جاگ جاگ کر گزاری تھیں۔ اس کو اس لمحے کا انتظار تھا۔ خدا سے دوبدو باتیں کرنے کے لیے اس کا ننھا سا دل ہر وقت قلابازیاں کھایا کرتا۔ کتنی مرتبہ وہ آسمان سے جا جا کر واپس آئی تھی۔ کتنی ہی مرتبہ وہ بلندی پر سے زمین پر ہٹخ دی گئی تھی۔ وہ تو وہ، اس کے پیغام بر، وہ ہلکی پھلکی ننھی منی بڑھیائیں جن سے وہ رات دن پیغام سلام بھجوایا کرتی تھی، الٹے پیروں واپس آجاتی تھیں۔ زہرہ کا دل سینے میں اڑنے سا لگتا۔

حیدر نے جو اس کے دوزخی ہونے کا فتویٰ دیا تھا، وہ شاید ٹھیک ہی ہے، وہ خود سے کہتی۔ شب بیداریوں اور دن رات کی عبادتوں کے باوجود اس نے اب تک وہ روشنی نہیں دیکھی تھی جس کے متعلق بچپن سے سن رکھا تھا۔ پھر چچا نے اس کو کھلے سر سڑکوں پر دیکھا اور کفر کا فتویٰ دے دیا۔ لمحے بھر کو زہرہ کا سر بھنا گیا۔ اس کا دل چاہا وہ چچا کا منھ نوچ لے۔ چچا ایسے ہی بات بے بات اس کو ٹوکا کرتے۔ ان کی نگاہیں ہمیشہ زہرہ کے کھلے سر اور کھلے سینے پر پڑتیں۔ موٹی ململ کا دوپٹہ سینے پر پھیلائے اور سر پر منڈھے وہ خوف سے کانپا کرتی۔ کہیں ہوا سے دوپٹہ سر پر سے اتر نہ جائے۔ کہیں سینے پر سے سرک نہ جائے۔ سر ڈھکنے کی بات تو اس کی سمجھ میں آگئی تھی کہ کھلے سر پر شیطان چانٹے مارتا ہے۔ پر سینہ ڈھکنا! سپاٹ سینے میں ایسی کونسی ہنڈی رکھی تھی جس پر نامحرم کی نظر نہیں پڑنی چاہیے؟ یہ نامحرم بھی جانے کون ایکاایکی پیدا ہو گیا تھا۔ جوں ہی زہرہ کو گیارھواں برس لگا، بہت سے ہوؤں کے ساتھ ساتھ ایک اور ہوّے کا اضافہ ہو گیا جو دیدے پھاڑے ایسی ویسی جگہوں کو ہی تاکا کرتا۔

وہ سب آوازیں جو بچپن سے لے کر اب تک زہرہ کو ڈراتی رہی تھیں اور وہ سب نگاہیں جو

بچپن سے لے کر اب تک زہرہ کو ٹٹولتی رہی تھیں، آسیب کی طرح زہرہ کے وجود پر چھا گئی تھیں۔ وہ رات کو بار بار گھبرا گھبرا کر اٹھ جاتی۔

"الٰہی چودہ شعبان کی نصف شب کو ان سب کے بغیر سر والے سائے دیوار پر لہرائیں اور یہ سب چٹ پٹ ہو جائیں۔ حافظ نابینا، استانی بندی خانم، مولوی نورالدین، حیدر، چچا فیض الٰہی، چچی اور اماں سب..." زہرہ نے رات کے اندھیرے میں نماز کی چوکی پر بیٹھ کر دعا مانگی۔ صحن میں برابر برابر سب کے پلنگ بچھے ہوئے تھے۔ سب گھر والے بے خبر سو رہے تھے۔ زہرہ آنکھیں آسمان پر گاڑے بیٹھی تھی۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے مسجد کے خاموش گنبد بول رہے ہوں اور چچا فیض الٰہی کے سینے سے انتہائی دل دہلانے والی آوازیں نکل رہی ہوں۔ بھابی کے عجیب الخلقت بچے سب کے سب سوئے پڑے تھے پر زہرہ کو محسوس ہو رہا تھا کہ وہ سب اس کی گردن پر سوار ہیں۔ اماں سروتا ہاتھ میں لیے بیٹھی ہیں اور کھٹاکھٹ مار رہی ہیں۔ زہرہ نے شلوار کا پائنچہ اوپر چڑھایا۔ نیلے نیلے بیسیوں نشان اس کی پنڈلیوں پر پڑے تھے۔ ہر چیز بڑی اور ڈراؤنی ہو کر اس کے سامنے آ رہی تھی۔ اس کو لگ رہا تھا کہ حافظ نابینا اندھی آنکھوں سے اس کو گھور رہے ہیں اور استانی جی زور زور سے کمر پر دھموکے لگا رہی ہیں۔ حیدر انگوٹھے اور انگلی کا حلقہ بنائے اس کی قبر کو سکیڑ رہا ہے اور لمبی ٹانگوں والا ہرن اس کی طرف بڑھتا آ رہا ہے۔ خوف پھیل کر اس کے پورے وجود پر چھا گیا۔ اس کے ہونٹ اَور زور زور سے ہلنے لگے۔ اس کی پھیلی پھیلی آنکھیں دیوار کو ٹٹول رہی تھیں۔ وہ بوکھلا کر کبھی آسمان کو دیکھتی اور کبھی دیوار کو ٹٹولتی، جس پر ابھی سب کے سائے پھیلیں گے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سب کے سر سایوں سے جدا ہو جائیں گے۔ اطمینان اور خوشی کے احساس سے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس کے شعور میں اسی ایک لمحے کا تصوّر تھا۔ اس نے آسمان پر ہنڈا سا چمکتا ہوا دیکھا۔ روشنی کا احساس زہرہ کے شعور سے نکل کر آسمان پر کوندے کی طرح لپکا اور غائب ہو گیا۔ غائب ہوتی ہوئی روشنی میں زہرہ نے دیکھا صحن میں سوئے سب گھر والوں کے سر جسم سے جدا تھے اور ان کے سائے دیوار پر پھیل رہے تھے۔ زہرہ خوشی سے بیخ اٹھی۔ ہوش کھو کر لمحے بھر میں وہ ساری سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

تقریب

گھر میں کوئی تقریب ہونے والی تھی۔

مالی جو کبھی کبھار نظر آتا تھا صبح سویرے آ گیا تھا اور میدان میں بکھرے ہوئے تنکے پتے اٹھا رہا تھا۔ موسمِ سرما کا آغاز تھا درختوں کے پتے گر چکے تھے اور پھولوں کی کیاریوں سے رنگ آہستہ آہستہ اُڑتے جا رہے تھے۔ بیگم عابد علی نے سوچا، اس سے پہلے کہ موسم میں شدت پیدا ہو کیوں نہ گھر کے کھلے لان میں ایک تقریب منا لی جائے۔ یہ سوچ کر وہ گھر میں ہونے والی تقریب کی تیاریوں میں مصروف ہو گئیں۔ مالی نے لان کی زرد اور بھونسلی گھاس کاٹنی شروع کر دی اور روشوں کی چھوٹی بڑی نوکوں کو برابر کرنے کے بعد گملوں کو اٹھا اٹھا کر باہر رکھنے لگا۔

روز روز کی تقریبات بیگم عابد علی کے سامنے بے شمار مسائل کھڑے کر دیتی تھیں۔ اب آج رات بھی، جب وہ ایک تقریب کرنے کا ارادہ کر چکی تھیں، وہ پریشان تھیں۔

مسئلہ یہ نہیں تھا کہ کیا پہنا جائے بلکہ یہ کہ کیا نہ پہنا جائے۔ عابد منزل میں تقریبات اس قدر پے در پے ہوتی تھیں کہ ان کو سوچنے کا موقع بھی مشکل سے ملتا تھا۔

بیگم عابد علی دبلی پتلی خاتون تھیں جو اپنی عمر کا اڑتالیسواں سال پورا کر چکی تھیں۔ وہ رولی پولی پڈنگ بنانے کی ترکیب ذہن میں دہرانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں اور ذہن سے زیادہ انھیں اپنی عمر سے شکوہ تھا۔

"ایک عمر پر آ کر آخر انسان اس قدر غبی کیوں ہو جاتا ہے!"

اور ایک مشکل یہ تھی کہ ایسی تمام تقریبات کا کھانا وہ خود اپنے ہاتھ سے تیار کرتی تھیں۔ کھانے کی تیاری کے ساتھ ساتھ انھیں شام کی تقریب کے لباس کی بھی فکر تھی۔ سلک کی پھول دار ساریوں کو الگ ہٹانے کے بعد وہ فرنچ شفون کے متعلق سوچ رہی تھیں۔ موسم میں لطیف سی خنکی پیدا ہو چلی تھی۔ اچھی خاصی گرمی پڑتے پڑتے قدرے ٹھنڈی ہوائیں چلنے لگیں اور ان ٹھنڈی ہواؤں نے پھر بیگم عابد علی کے سامنے ڈھیروں مسائل کھڑے کر دیے۔ نیچے گلے اور بغیر آستین کے بلاؤز کے بغیر تو ساری کی دلربائی ختم ہو جاتی ہے اور پھر اس موسم میں فرنچ شفون کی "ہما" سے خریدی ہوئی ساری بھی نہیں پہنی جا سکتی۔ را سلک کا فیشن بھی بس ختم ہی ہو رہا تھا۔ انھوں نے کمرے میں چلتے ہوئے اپنی کپڑوں کی الماری کھولی۔ ساریاں ـــــ زری اور ریشم کے کام کی ساریاں، باتک اور اجرک، بارڈر والی ساریاں، اور بغیر بارڈر والی ساریاں، فرنچ شفون، امریکن جارجٹ، چائنیز سلک، وولی اور کریپ۔ انھوں نے الماری کا دوسرا پٹ کھولا۔ لمبی، درمیانی اور اونچی پوشاکیں۔ ہر فیشن اور ہر وقت کے لباسوں سے الماری پٹی پڑی تھی۔ نیچے کے تختوں میں جوتوں کی قطاریں تھیں اور درمیان میں صبح و شام اور رات کے بٹوؤں کے ڈھیر۔ بیگم عابد علی الماری کھولے کھڑی تھیں اور سوچ رہی تھیں کہ کیا پہنوں اور کیا نہ پہنوں۔ اپنے جسم کی طرف سے تو وہ مطمئن تھیں۔ ان کا جسم بالکل نوعمر لڑکیوں جیسا تھا۔ بڑی محنت کرنی پڑ رہی تھی ان کو جسم کو متناسب رکھنے کے لیے، کہ ہر لباس پہننے کے لیے ایک مخصوص جسم درکار ہوتا ہے۔

"کاش مصنوعی چھاتیوں کی طرح جسم اور اعضا بھی فروخت ہوا کرتے۔" باہر سے منگوانا ان کے لیے مشکل نہیں تھا۔ جہاں اور دوسرا سامان آتا ہے وہاں مصنوعی چھاتیاں، گول مٹول کولھے، سڈول پنڈلیاں، وہ سب کچھ منگوا لیتیں۔ ایک الماری ان سب چیزوں سے بھری رہتی۔ جو لباس پہننا ہوا اس کے مطابق اعضا کو جوڑا اور انتہائی مناسب اور متناسب جسم تیار ہو گیا۔ پر مشکل تو اس وقت یہ آ پڑی تھی کہ ہر قسم اور ہر فیشن کا لباس موجود تھا مگر جسم وہی ہزار مرتبہ کا دیکھا بھالا اور برتا ہوا۔ ایک ہی طرح کا، دبلا پتلا اور نسوانی ابھاروں سے خالی۔ بیگم عابد علی کا سراپا دیوار میں جڑے ہوئے شیشے میں دانت نکوسے انھیں گھور رہا تھا۔

دن آہستہ آہستہ گرم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ بیگم عابد علی نے باورچی خانے میں جا کر

ریفریجریٹر کے سارے خانوں کو الٹ پلٹ کر ڈالا- مٹر، سیم، گاجر، ہری مرچ، کرم کلا، گوبھی، ہری پیاز، گوشت کے پارچے، اجینوموٹو، سویا ساس اور سلاد آئل ــــ ان سب چیزوں کو شمار کرنے کے بعد انھوں نے ثابت دھنیے اور سونف کی پوٹلی بنائی- گوشت جو پہلے ہی دیگچی میں رکھا ہوا تھا اس میں پوٹلی اور لہسن پیاز کی پوتھی ڈالنے کے بعد انھوں نے قدرے اطمینان کا سانس لیا-

مختلف تہذیبوں کے کھانوں کے ملغوبے تیار کرتے ہوئے وہ ہمیشہ بوکھلا سی جاتی تھیں- چینی کھانے اور بریانی تک تو ٹھیک تھا- مسئلہ صرف میٹھے کا تھا- یہاں آ کر انھیں پھر بڑھتی عمر کا احساس ہوا- انھوں نے باورچی خانے کی کھڑکی میں سے باہر جھانکا- لان کی گھاس برابر کرنے کے بعد مالی بھونسلی زمین پر سے کوڑا کرکٹ اٹھا رہا تھا- سوکھے پتّوں کو ایک جگہ جمع کر کے آگ لگا دی گئی تھی- کسیلا دھواں گھرا ہو کر میدان میں بنی ہوئی دیوار پر سے گزر کر گرد و غبار میں ملتا جا رہا تھا- دیوار کے پیچھے جمعداروں کی پوری جماعت بیٹھی ہوئی ملک کے سیاسی اور معاشی مسائل پر تبادلۂ خیال کر رہی تھیں- مسائل جو تمام تر ان سے وابستہ تھے- ملک کے اہم اور بڑھتے ہوئے مسائل- وزارت کی کرسی سے لے کر قبر کی زمین تک ہزارہا مسائل ان کو حل کرنے تھے- یہ مسائل ملک کی آدھی سے زیادہ آبادی کو مصروف رکھنے کے لیے اعلیٰ گھرانوں اور اعلیٰ معاشرے نے پیدا کیے تھے- بڑی سخت محنت کی گئی تھی ان کو پیدا کرنے میں- مسائل جو انسان کی میراث ہیں- وہ یوں ہی نسل در نسل چلتے چلے آ رہے ہیں- یہ قرنوں پرانے بھی ہیں اور بالکل نئے بھی- بالکل اس پودے کی طرح جو میدان میں خود ساختہ پہاڑی پر سر اٹھائے کھڑا ہے، خاردار اور گول تنے والا سبز کاہی پودا- یہ جماعت باہمی افہام و تفہیم کے ذریعے گھروں میں کام نہ کرنے کا مکمل طور پر فیصلہ کر چکی تھی، اس لیے اس رہائشی آبادی میں صبح سویرے سے دھڑا دھڑ صفائی شروع ہو جاتی تھی- گھروں میں رہنے والی بیگمات جھاڑو پنجہ سنبھال کر جمعداروں کے دماغ درست کرنے کا عزم کر چکی تھیں- اس میں دوہرا فائدہ تھا- پیسے کی بچت کے ساتھ ساتھ جسم کی زائد چربی بھی پگھلنی شروع ہو گئی تھی- گھر کے اور کاموں میں اس مزید کام کا اضافہ صرف ان خواتین کو ناگوار گزرتا تھا جو ملازمت پیشہ تھیں اور جو اپنے گھر کے اندر اور گھر کے باہر کے کاموں میں توازن قائم کرنے کی کوشش میں بوکھلائی ہوئی سی رہنے لگی تھیں- ایسے میں ان کو بڑے مکان کی خرابی کا احساس شدّت سے ہوتا تھا-

وہ گھر کو سکیڑتیں مگر سماجی برتری کا ہوا پھر اسے چاروں طرف سے پھیلا دیتا اور وہ بانپ بانپ کر گھر کی صفائی ستھرائی میں لگ جاتیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ چھوٹے لوگوں کی بڑی بڑی سوچوں پر بھی کڑھتی رہتیں۔ چھوٹے آدمی جو بڑی تیزی سے بڑے ہو رہے تھے۔

''وہ خاکسار تحریک، مقبول الٰہی اور جھاڑو پنجہ۔ بھنگیوں کی ہڑتال کون بندہ بشر بھول سکتا ہے!'' بیگم عابد علی کی ساس دھوپ میں بیٹھے بیٹھے بڑبڑائیں۔ یہ بزرگ خاتون صرف گزرے ہوئے لوگوں کے ساتھ زندہ تھیں۔ وہ کیا بولتی تھیں، کیا کہتی تھیں اور کس سے کہتی تھیں، گھر والوں میں کسی کے پاس ان کی بات سننے اور سمجھنے کے لیے وقت نہیں تھا۔ ان کی بات مجذوب کی بڑ نہیں تھی۔ وہ بجائے خود ایک پوری تاریخ تھیں گزرے وقت کی بڑی واضح علامت۔

سورج میں حدّت بڑھ جانے کے بعد مالی نے کانوں کے گرد بندھا ہوا مفلر کھول دیا اور اپنے سرج کے کوٹ کو سفیدے کے سوکھے لمبوترے تنے پر لٹکانے کے بعد پودوں پر قینچی چلانے لگا۔ بیگم عابد علی جو ابھی تک باورچی خانے میں کھڑی اپنے غبی پن پر کڑھ رہی تھیں، اب باہر آ کر کھڑی ہو گئی تھیں اور مالی کو ہدایات دے رہی تھیں۔ مالی کو ہدایتیں دیتے وقت وہ یہ قطعی بھول گئیں کہ رولی پولی کی طرح یہ بھی ان کا میدان نہیں ہے۔ ان کی دونوں لڑکیاں نزہت اور مدحت اپنے سروں پر مہندی لگانے کے بعد چہرے پر لگانے کے لیے کچھ ملغوبے گھول رہی تھیں۔ انڈے کی سفیدی میں خمیر کے سوکھے دانوں کو گھولتے ہوئے نزہت نے مدحت سے کہا:

''چہرے کا لیپ تمہاری جلد کے لیے مناسب نہیں۔''

''میں نے گرم پانی میں گلیسرین ڈال کر بھاپ کا غسل لے لیا ہے۔ روغن زیتون کی مالش کرنے کے بعد شام کو ہلکا میک اپ کر لوں گی۔''

''بیوٹی شاپ نزدیک ہے، بالکل پیدل کا راستہ۔ صبح کا وقت چہرے کو نوچنے کھسوٹنے کے لیے مناسب بھی ہے،'' ارشد، جو قریب کھڑا ان کے لتھڑے ہوئے چہروں کو بغور دیکھ رہا تھا، بولا۔

''یہاں سے بہترین مشورے حاصل کیجیے... تم اپنی اس چتکبری جینز پر ایک لیبل کا اور اضافہ کر سکتے ہو،'' مدحت بولی۔

''آج کی تقریب کا مقصد؟'' احمد نے پوچھا۔

''عابد منزل کی تقریبات میں ایک اور تقریب کا اضافہ!'' زبہت نے اپنے چہرے کے روئیں کو موچنے سے نوچتے ہوئے کہا۔

خوب! تو بچوں کو تقریب کا مقصد بھی نہیں معلوم، بیگم عابد علی نے لان میں کھڑے کھڑے سوچا اور نظر اٹھا کر ان سب کو باری باری دیکھا۔

یہ خود اپنے متعلق بھی کبھی کبھار ہی سوچتے ہوں گے، انھوں نے دل میں کہا۔

سیڑھیوں پر کبھی بھاری قدموں کی آوازیں ابھرتیں اور کبھی ان نوکیلی آہنی ایڑیوں والے جوتوں کی کھٹ کھٹ سنائی دیتی جو آج کی تقریب کے لیے زبہت نے خریدے تھے اور جن کو ہفتہ بھر سے پہن پہن کر وہ اپنی چال میں وقار پیدا کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ جوتوں کی کھٹ کھٹ سن کر بیگم عابد علی کی ساس مستقل بول رہی تھیں:

''اللہ مارے یہ جوتے ہیں! نہ سلیم شاہی اور نہ گرگابی، میری کنپٹیوں پر کیوں ہتھوڑے برسائے جا رہے ہیں!''

''ان کو نہ خوشبوئیں پسند ہیں اور نہ آوازیں۔ اگر ایک عمر پر آ کر پیر پلٹ جایا کرتے پھر یہ سب قصے ہی ختم ہو جاتے، ماضی اور حال کے تنازعے!'' بیگم عابد علی نے دل میں کہا۔

لڑکے اور لڑکیاں تقریب شروع ہونے سے پہلے اپنا سب کام نمٹانے کے متعلق سوچ رہے تھے۔ ان کی بول چال اور چلت پھرت میں تیزی آ گئی تھی۔ احمد اپنے جوتے چمکانے کے بعد استری کی نوک سے اپنی بڑے پائنچوں والی اکلوتی فیشن ایبل جینز میں چند مزید دھبوں کا اضافہ کر رہا تھا۔ میلی اور پھٹی پرانی جینز پہننے کا رجحان بڑی تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ استری کرتے کرتے اس کی نظر اپنے چمک دار جوتوں پر پڑی۔ ابتدائی عمر کا پڑھایا ہوا صفائی ستھرائی کا سبق کسی نہ کسی جگہ اپنا اثر اب بھی کر جاتا تھا۔

''اُدھڑی ہوئی بوسیدہ جینز کے ساتھ چمک دار جوتے!''

''صفائی بہر کیف جزوِ ایمان ہے!'' بزرگ خاتون کے پلنگ کے قریب سے آوازیں آ رہی تھیں۔

جوتوں کی چمک سے نظریں چراتے ہوئے اس نے اپنی چمڑے کی جیکٹ کو دیکھا۔ جیکٹ پر جگہ جگہ کھانے پینے اور چکنائی کے چکتے پڑے ہوئے تھے۔ جیبوں اور کالر کے پاس سے اس کا رنگ اُڑ گیا تھا اور کہنیوں پر دوسرے رنگ کے پیوند لگے ہوئے تھے، جہاں میل کی کی تہہ دوسری اور جگہوں سے زیادہ موٹی تھی۔ اس نے پسندیدگی سے گردن ہلائی اور کندھے اچکاتا ہوا باورچی خانے سے گزرتا ہوا سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ بیگم عابد علی نے اپنی ناک سکیڑی۔ وہ خوشبوؤں کی دیوانی تھیں۔ سڑاند اور بدبو کے بھپکوں پر وہ اب بھی چوری چھپے ناک بھوں چڑھا لیتی تھیں۔ ایسے وقت میں ان کی انگلیاں اپنے نیچے گلے والے بلاؤز کے اندر کلبلاتیں اور سینے کے مصنوعی ابھاروں میں خفیف سی حرکت ہوتی۔ ان کو اس روئی کے پھوہے کی تلاش ہوتی جو وہ ایسے موقعوں کے لیے اپنے محرم کے اندر رکھتی تھیں۔ لمبے لمبے سانس لیتی ہوئی وہ پھر باہر نکل آئیں اور ہاتھ کا چھجا بنا کر لان کا جائزہ لینے لگیں۔ لان میں خزاں کے باوجود تراوٹ اتر آئی تھی۔ سوکھے پودے کاٹ چھانٹ اور دھلنے کے بعد فضا کو تازگی کا تاثر دے رہے تھے۔ گول اور لمبی میزیں تھوڑے تھوڑے فاصلے پر رکھ دی گئی تھیں اور ان کے گرد رنگین کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ نزہت اپنے چہرے پر گاڑھا لیپ چڑھائے مدحت کی خشک جلد والے چہرے کو گھور رہی تھی۔ ''اس قدر خشک جلد پر کون سا میک اپ کیا جا سکتا ہے!'' سامنے سنگھار میز پر مختلف مصنوعات کی شیشیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بیگم عابد علی نے لان میں کھڑے کھڑے بلاؤز کے اندر اپنی ولایتی لیس کے محرم کے تناؤ کو محسوس کیا اور پھر اندر باورچی خانے میں آ کر مختلف کھانوں کے مسالوں کو ترتیب سے رکھنے لگیں۔ چولھے پر رکھی ہوئی دیگچی میں اُبلتے ہوئے گوشت کی خوشبو پر ان کے ناک کے نتھنے کانپے۔ قدیم اور روایتی کھانے! یخنی کی خوشبو! یہ خوشبو دم توڑتی ہوئی دیگچی کے باہر آ رہی تھی۔

کہیں یہ آج کے کھانے کی آخری خوشبو تو نہیں، بیگم عابد علی کے ہاتھ قدرے کانپے اور انھوں نے دیگچی کا ڈھکنا کھول کر گہرا سانس لیا۔

شروع اور اخیر کا کچھ پتا ہی نہیں چلتا۔ کوئی بھی چیز کب شروع ہوتی ہے اور کب ختم ہوتی ہے ـــ بہرحال! بیگم عابد علی ترکاری کے ننھے ننھے ٹکڑے کاٹنے لگیں اور جھینگوں کی قاب میں سویا ساس ڈال کر ان کو انڈے کی سفیدی کے ساتھ لتھیڑ دیا۔ باہر برآمدے میں لیٹی ہوئی ان

کی ساس نے ڈوپٹے کا گولا بنا کر ناک پر رکھ لیا اور اپنے سیدھے پیروں سے الٹا چلتی ہوئی بڑبڑائیں۔
"گاگروں میں چھلکتا ہوا دودھ اور کوری ہنڈیوں میں دانے دار گھی۔ ہندو گوالن پگڈنڈیوں پر سے گزرتی ہوئی آرہی ہے۔ بابا نہ انڈیلو یہ چکناول۔ لو وہ میکائیل رزق کے خوان لیے آسمان کی طرف پلٹ رہے ہیں۔ بلا لو دوڑ کر۔ بابا، وہ اصلی اور زعفرانی خوشبوئیں۔ من و سلویٰ! خدایا اس رزق کے دروازے بند کر لے۔ مجھ سے یہ کھانا نہیں نگلا جاتا!" انھوں نے باورچی خانے سے اٹھتی ہوئی سویابین کے تیل کی خوشبو کو اپنے سے دور دھکیلتے ہوئے کہا۔

بیگم عابد علی کے ہاتھ اور ذہن دونوں تیز تیز چل رہے تھے۔ کھانا پکانے کے بعد انھیں مسز منوالا کے گھر میں بھی جانا تھا۔ مسز منوالا سے ان کی دوستی میں ان پودوں کا دخل تھا جو وہ ایسی تقریبات کے موقعوں پر ان سے مانگ لیا کرتی تھیں۔ مثلاً ربر کے پودوں کے چند گملے جو مختلف مقام پر رکھنے کے بعد اچھے ذوق کی نمائندگی کرنے میں کافی مددگار ثابت ہوتے تھے۔ مونٹیسریا، ہاتھی کے کانوں سے ملتے جلتے پتوں والا پودا اگر کسی بھی جگہ رکھ دیا جائے تو سب پر رعب پڑنا یقینی تھا۔ پودے دیتے وقت مسز منوالا، جو دبلی پتلی پارسی خاتون تھیں اور فطرتاً بے حد کنجوس واقع ہوئی تھیں، پودوں کی نفسیات بتانے سے نہیں چوکتی تھیں۔

"ربر کا پودا اور اس جیسے تمام پودے اپنے ماحول اور اپنی جگہ سے ایک خاص قسم کا تعلق رکھتے ہیں۔ جگہ سے ہٹانے پر یہ اپنی فطری خوبصورتی اور بڑھوار کھو دیتے ہیں۔"

"کیا گھنٹے دو گھنٹے کا فرق بھی؟"

"ایک لمحہ بھی بہت کافی ہے۔ یہ عجیب و غریب تعلق صرف ان کی فطرت کا خاصہ ہے۔ ہم انسانوں کی زندگی میں ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ہمارا تعلق کس سے ہے اور یہ تعلق کیسے نبھایا جاتا ہے! میں چھ بچوں کی ماں ہوں اور میرا یہ گھر بھائیں بھائیں کرتا ہے۔ ان بچوں میں سے کوئی بھی ان دیواروں اور اس مٹی سے اپنا تعلق قائم نہ کر سکا۔ اب وہ کرۂ ارض کے مختلف حصوں میں اپنا آپ کھوجنے کو نکلے ہوئے ہیں۔"

مسز منوالا ہمیشہ بے حد بولتی تھیں۔ دراصل اکیلے اور خاموش رہتے رہتے انھیں ایک مدت ہو گئی تھی۔ وہ پودوں تک کی گونگی زبان اور احساسات سمجھنے لگی تھیں۔ انھیں کب بھوک لگتی ہے اور

کب پیاس۔ وہ کب خوش ہوتے ہیں اور کب غم سے گردن ڈال کر پڑ رہتے ہیں۔ کب خفا ہوتے ہیں اور کیسے من جاتے ہیں۔ کون سا موسم ان کے لیے سازگار ہے اور کون سی ہوا ان کی پنکھڑیوں اور رگوں کے لیے مضر۔ وہ اول اور آخر ماں تھیں۔ ان کو بولتا ہوا چھوڑ کر بیگم عابد علی واپس اپنے گھر آ گئیں۔

کس قدر بولتی ہے یہ عورت۔ بھلا بچے کیسے نہ بھاگتے! واپسی پر انھوں نے سوچا۔ عمر بڑھ جانے سے انسان سٹھیا بھی جاتا ہے شاید!

بیگم عابد علی اپنے آپ کو سن رسیدہ محسوس کرنے لگیں اور ان کا دل چاہا وہ بھی مسز منوالا کی طرح گھر میں رہنے والوں کی بے تعلقی پر بے تکان بولنا شروع کر دیں جن کو گھروں میں ہونے والی تقریب کا مقصد تک نہیں معلوم۔ کم از کم گھر کے افراد کو اتنا تو ضرور معلوم ہونا ہی چاہیے۔

اگر انسان ربر کے پودے ہوا کرتے جو اپنی جگہ سے کھسک جانے پر اپنی قدرتی خوبصورتی کھو دیتے ہیں تو زندگی کس قدر آرام سے گزرتی، انھوں نے سوچا۔

"تمام نرم اور لطیف احساسات آہستہ آہستہ درختوں اور پودوں میں سرایت کرتے جا رہے ہیں۔ میں ان پودوں کا گہرا مطالعہ کرتی رہتی ہوں۔"

یہ بات مسز منوالا نے بتائی تھی جب بیگم عابد علی کسی ایسی ہی تقریب کے موقع پر موسمی پھولوں کے گملے مانگنے گئی تھیں۔

"میں تمھیں زینیا کے چند گملے دے سکتی ہوں۔ سرخ جرینیم تم بے شک لے جا سکتی ہو۔ پر سفید ـــــ اوں ہنھ! ذرا سی رنگ کی آمیزش اس پودے کا ستیاناس مار دیتی ہے۔ یہ اپنا آپ ختم کر کے دوسروں کو شگفتہ رکھنے والا پودا ہے۔ اس کی انفرادیت کو بڑے سنبھال کر قائم رکھنا پڑتا ہے۔"

واپسی پر بیگم عابد علی نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا تھا، مدحت اور نزہت جو ہیں وہ وہ نہ ہوتیں۔ کیا یہ دونوں بچیاں للی اور ڈیزی کے خوبصورت احساساتی پودوں میں تبدیل کی جا سکتی ہیں؟ اور ارشد اور احمد؟ انھوں نے برآمدے میں رکھے ہوئے ربر کے پودے کو دیکھا جو وہ ابھی ابھی مسز منوالا کے گھر سے لے کر آئی تھیں جس کے پتے ان کے مکان کے برآمدے میں نہ صرف تروتازہ

تھے بلکہ ان کے سبز کاہی رنگ نے ارد گرد کی ہر چیز کو گہرے ہرے رنگ میں ڈبو دیا تھا۔ اپنے برآمدے میں کرسی ڈالے مسز منوالا ایک ایک پتے پر روغنِ زیتون کی مالش کر رہی تھیں۔ ان کے سرمئی سر پر رنگ برنگ پھولوں کا عکس پڑ رہا تھا اور اس وقت وہ اپنی عمر سے کہیں چھوٹی دکھائی دے رہی تھیں۔

بیگم عابد علی گہرے خیالات میں ڈوب گئیں۔

کاروبار کے چکر، درآمد برآمد کا دھندا، غیر ملکی دورے، بدیسی سامان اور غیر ملکی نوادرات ـــ وہ اپنی بیس بائیس سالہ ازدواجی زندگی میں ان تمام چیزوں کے انبار میں سے ایک تعلق کو تلاش نہیں کر پائی تھیں جو ان کو عابد علی سے تھا۔ انہیں خبر نہیں تھی کہ وہ کون ہیں۔ کم از کم ایک مرتبہ ان کو اتنا تو معلوم ہو جائے کہ وہ آخر ہیں کون؟ عابد علی سے ان کا کیا تعلق ہے؟ گھر میں ایک چلتا پھرتا سایہ کسی نہ کسی وقت نظر ضرور آتا تھا۔ پر تعلق... کس سے کس کا تعلق؟ انھوں نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ تیز نیلے رنگ کے سوٹ میں ایک بھاری بھرکم سایہ برآمدے کی لمبان پر سے گزرتا ہوا لمبی راہداری کو عبور کرتا ہوا ان کے سامنے سے گزرتا چلا گیا... برآمدے کی سیڑھیوں پر رکھا ہوا مونٹیسریا اپنے لمبے کانوں والے پتوں کو گرا کے کمھلانا شروع ہو گیا تھا۔ دیوار کے پیچھے مسز منوالا کا سر بار بار اُبھرتا اور پھر غائب ہو جاتا تھا۔

یہ پودے مشکل سے ہی شام تک تازہ رہ سکیں گے، لیکن شام تک تو ان کو ٹھیک ٹھاک رہنا ہی ہے۔ شام کی تقریب میں مختلف دیسی اور ولایتی کھانوں کے علاوہ مختلف قومیت کے لوگوں کو دعوت دی گئی تھی۔

بیگم عابد علی نے چلتے ہوئے میدان پر ایک نظر ڈالی۔ سورج اب درختوں کی پھننگوں کو چھوتا ہوا گزر رہا تھا۔ ڈوبتے سورج کا گہرا نارنجی رنگ بھونسلی زمین پر بکھرا ہوا تھا۔ میزوں کے گرد بڑی تعداد میں رنگین کرسیاں بچھا دی گئی تھیں۔ تلی ہوئی مونگ پھلی، ساگودانے کی چھوٹی چھوٹی ٹکیاں؛ خشک میوہ اور پنیر کے ننھے ننھے ٹکڑے چاندی کی نقشیں کٹوریوں میں مختلف انداز سے رکھے ہوئے تھے۔ ان کے گھر کی لمبی راہداری پر پھولوں کے مختلف گملے رکھ دیے گئے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے ایک ایک پودے کو گھور رہی تھیں۔ ان کا دل دُھکڑ پکڑ کر رہا تھا۔ مسز منوالا پودوں

کی نفسیات کی ماہر تھیں۔ ان کا مطالعہ بھی گہرا تھا اور وہ مختلف وقتوں میں مختلف تجربات سے بھی گزری تھیں۔

مہمانوں کے آنے سے پہلے اگر یہ سب گردن ڈال بیٹھے؟ بیگم عابد علی پودوں کو گھورتی ہوئی واپس باورچی خانے میں آ گئیں۔ یخنی کی دیگچی کا ڈھکنا کھول کر انھوں نے دیکھا۔ گوشت گل چکا تھا۔ انھوں نے سونف اور دھنیے کی پوٹلی کو نکال کر پھینک دیا اور لہسن اور پیاز کی پوتھی کو الگ کرنے کے بعد پانی کو نتھار کر الگ رکھ دیا۔ دیگچی کا ڈھکنا کھلنے پر جو خوشبودار بھاپ نکل کر باہر گئی اس پر برآمدے میں بیٹھی ہوئی بزرگ خاتون کے نتھنے کانپے۔ انھوں نے گہرا سانس لیا اور ناک کے راستے خوشبو کا بڑا سا گھونٹ بھر کر اپنے اندر انڈیل لیا۔

بیگم عابد علی نے دیگچی چولھے پر رکھنے کے بعد اپنے سراپے پر نظر ڈالی۔ تقریبات اور ہنگاموں سے نبٹتے نبٹتے وہ ان حالوں کو پہنچ چکی تھیں۔ بہترین دیسی، ولایتی اور چینی کھانے تیار کرتے ہوئے انھیں بیسواں سال تھا۔ ان کے سوکھے پھپھوند لگے ہوئے بالوں پر عمر کی گرد جم چکی تھی۔ خشک اور بدرونق جلد کو وہ بڑی مشکل سے زندہ رکھے ہوئے تھیں۔ پھر بھی سیاہ و سفید دھبے، دنوں، مہینوں اور سالوں کی تھکن، گھر کے اندر رہنے والوں کی ایک دوسرے سے بے تعلقی... گھر میں کل کتنے افراد تھے؟ وہ کس کی بیوی اور کس کی ماں تھیں؟ کون سا تعلق کب اور کیسے پیدا ہوا؟ وہ یہی سب سوچتی ہوئی واپس اپنے کمرے میں آ گئیں جہاں پلنگ پر مختلف لباس بکھرے ہوئے تھے۔ وہ ابھی تک طے نہیں کر پائی تھیں کہ شام کو ہونے والی تقریب میں کیا پہنیں گی۔ سب سے اوپر جو لباس پڑا ہوا تھا اس کے متعلق عابد علی نے بتایا تھا کہ دکان دار نے دیتے وقت کہا تھا:

"یہ واحد لباس ہے۔ ہم ایک نمونہ ایک وقت میں تیار کرتے ہیں۔ رات کے کھانے پر پہننے کے لیے اس کے ساتھ لومڑی کی کھال کی شال ضروری ہے۔ وہ کھال برابر والے اسٹال سے مل جائے گی۔ پر قیمت..." دکان دار نے اپنی بالائی مونچھ پر زبان پھیری اور عابد علی کی جیب کی طرف دیکھا۔

ایشیائی شہزادہ! منحنی دکان دار مسکرایا۔

بس یہ لباس ٹھیک ہے۔ منفرد بھی ہے اور موقعے اور موسم کے لحاظ سے بھی مناسب ہے۔

انھوں نے پلنگ سے اٹھ کر چہرے کو بھاپ کا غسل دیا اور روغنِ زیتون کی مالش کرنے کے بعد چہرے کو کھلی ہوئی کھڑکی کے باہر کر دیا۔ اس عمل سے کافی فرق پڑا۔ وہ مطمئن ہو کر واپس باورچی خانے میں آ گئیں۔ کھڑکی کے سامنے ننگا درخت کھڑا تھا۔ اس کے پتے اوائلِ خزاں میں ہی جھڑ گئے تھے۔ موسم کی تبدیلی آہستہ آہستہ اس پر اپنا اثر کر رہی تھی۔ سردیوں کا سرد اور خشک دن اس پر سے گزرتے ہوئے لمحے بھر کے لیے ٹھہرا تھا۔ سورج غروب ہونے پر اکیلی چڑیا اس ٹھنٹھ پر آ کر بیٹھ گئی۔ فاختئی رنگ والی یہ مینا اپنے ٹھکانے کو بڑی اچھی طرح پہچانتی تھی۔

اب سورج درختوں کی ٹہنیوں پر سے گزرتا ہوا بادلوں میں چھپ گیا۔ اب سے تھوڑی دیر پہلے جو ہلکا نارنجی رنگ میدان میں پھیلا ہوا تھا اس پر آسمان سے چھنتی ہوئی سرمئی دُھند کا غلاف چڑھتے دیکھ کر بیگم عابد علی نے لان کی ساری بتیاں جلا دیں۔ روشنی گول اور لمبوتری میزوں پر سے گزرتی ہوئی ان نقشیں کٹوریوں میں جا کر ٹھہر گئی جن میں خشک میوہ، ساگودانے کی ٹکیاں اور پنیر کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ نزہت اور مدحت زینے کی سیڑھیاں چڑھ اور اتر رہی تھیں۔ انھوں نے اپنے بالوں میں لگے ہوئے رولز نکال لیے تھے اور ان پر زور زور سے برش کر رہی تھیں۔ ان کو ہر تقریب کے لیے اسی طرح تیار ہونا پڑتا تھا۔ چہرے کا لیپ، بھاپ کا غسل، بالوں کو رنگنا، ناخنوں کو تراشنا، غیر ضروری بالوں کو نوچنا اور ضروری بالوں کو سنوارنا، ان تمام مصروفیات میں انھیں دن گزرنے کا احساس تک نہیں ہوتا تھا۔ انھیں اندازہ نہیں تھا کہ انھوں نے اپنی عمر کے کتنے بہت سے سال محض دوڑ بھاگ میں گزار دیے تھے۔ یوں ہی چہروں پر گاڑھے گاڑھے لیپ چڑھا کر وہ ہر صبح گھر کے صحن اور برآمدوں میں بدروحوں کی طرح بھٹکتی رہتی تھیں۔ ان کو دیکھ کر بزرگ خاتون اپنے گالوں پر زور زور سے طمانچے مارتیں۔

''الٰہی شیطان طوفان سے بچائیو!'' جب لاحول پڑھتے پڑھتے ان کا حلق سوکھنے لگتا تب وہ پلنگ سے اٹھ کر ٹٹولتی ہوئی باورچی خانے تک جاتیں کہ ان کی ناک میں سویابین کے تیل کا بھبکا آتا اور وہ ابکائیاں لیتی ہوئی پلٹ آتیں۔

''نہ جائفل نہ جاوتری۔ لیا اور ملغوبہ گھول کر رکھ دیا... کتوں کا راتب۔ ان زرد رنگت اور چپٹی ناک والوں سے بچو۔''

شام کی تقریب کی تیاریاں قریب قریب مکمل ہو چکی تھیں۔ بیگم عابد علی بار بار اندر باہر آ اور جا رہی تھیں۔ ہاتھوں میں بھاری بھاری چیزیں اٹھائے انھوں نے لان سے باورچی خانے اور باورچی خانے سے لان کے بیسیوں چکر کر ڈالے تھے۔ ان کی دونوں لڑکیاں سنگھار میز کے سامنے کھڑی اپنی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ ٹرانزسٹر پر کوئی اونچی دُھن بج رہی تھی۔ سنگھار میز کے شیشے میں ایک ہانپتے کانپتے سائے کو کبھی کبھی ابھرتے ہوئے دیکھ کر وہ چونک پڑتی تھیں۔ اتنی بہت سی تیاریوں کے بعد خود اپنا آپ اپنے لیے اجنبی ہو کر رہ گیا تھا۔ یہ تو پھر بیگم عابد علی تھیں... شام کی تقریب کے مخصوص لباس اور شانے کے گرد پڑی ہوئی شال میں آج کی تقریب کی میزبان۔

سامنے والی سڑک پر کار کی روشنیوں کو دیکھ کر وہ میدان میں ٹھہر گئیں اور میدان پر آخری نظر ڈالی۔ میدان میں تیز روشنی کے بلب روشن ہو چکے تھے۔ صوفوں اور میزوں کو قرینے سے لگانے کے بعد میدان میں کشادگی پیدا ہو گئی تھی۔ برآمدے کی آہنی جالی میں پڑے ہوئے پردے ہوا سے بل رہے تھے۔ کونے میں رکھی ہوئی میز پر بھورے رنگ کے گل دان میں سفید پھول لگے تھے۔ نیچے گوتم کی مورتی آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔ برابر میں رکھے ہوئے ٹیپ ریکارڈر پر مغربی موسیقی کی دھن بج رہی تھی۔ لان میں سگرٹوں کا دھواں اور باتوں کے مرغولے گڈمڈ ہو کر بکھرے ہوئے تھے۔ میز پر رکھے ہوئے گلاس تازہ مالٹوں کے عرق سے بھرے تھے۔ چاندی کے نقشیں پتوں میں سونف اور کٹا ہوا ناریل رکھا تھا۔ خشک میوے اور پنیر سے بھری ہوئی نقشیں کٹوریاں میدان میں گردش کر رہی تھیں۔ فضا میں مختلف بدیسی خوشبوئیں بکھری ہوئی تھیں۔ بیگم عابد علی مہمانوں کی خاطر مدارات میں مصروف ہو گئیں۔

"آپ یہ جوس لیں،" انھوں نے ایک خاتون کو جوس دیتے ہوئے ان کی گردن میں پڑے ہوئے سیاہ دھات کے نکلیس کو دیکھا جس پر فرانسیسی عمارتوں کے نقش و نگار ابھرے ہوئے تھے اور تیز روشنی میں چمک رہے تھے۔ وہ ہنس ہنس کر اپنے برابر بیٹھے ہوئے مرد سے باتیں کر رہی تھیں۔

"یہ میرے شوہر امجد حسین ہیں،" خاتون نے جوس لیتے ہوئے بتایا۔ "میں اپنے شوہر کو بس یوں ہی سا جانتی ہوں۔ ہو سکتا ہے کسی غلط شخص کا آپ سے تعارف کروا رہی ہوں اور تقریب

کے خاتمے پر پتا چلے کہ جن کو امجد حسین کہہ رہی تھی وہ دراصل بلگرامی صاحب تھے۔" خاتون نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ان کے برابر میں بیٹھے ہوئے مرد نے اپنی پیشانی پونچھی۔

"دراصل کاروباری مصروفیات اور زندگی کی تیز رفتاری... ایک دوسرے کو دیکھنے کے لیے بھی مشکل سے ہی وقت ملتا ہے،" بیگم نوازش علی نے کہا۔

"خوب! آپ کے ساتھ بھی یہی معاملہ ہے۔ ہم تو بس عابد منزل کی ان تقریبات کے منتظر رہتے ہیں۔ افوہ! کس قدر انتظار رہتا ہے ہمیں ان جانے پہچانے لمحوں کا۔ یہی وہ لمحے ہوتے ہیں جب ہم فرصت سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ واقعی ان تقریبات میں بڑی جان ہوتی ہے،" بیگم نوازش علی، حامد اللہ کی بیوی سے کہہ رہی تھیں۔

بیگم عابد علی سوچ رہی تھیں، اس قدر یکساں سوچ! یہ سب وہی کہہ رہی ہیں جو اب سے تھوڑی دیر پہلے میں سوچ رہی تھی۔ سوچنے سوچنے میں ہی تھوڑا فرق تو ہوتا۔

"میں بھی بیگم عابد علی کا شکریہ ادا کرنے والی تھی،" بیگم برنی نے بڑی ڈھٹائی سے بیگم عابد علی کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ بیگم عابد علی جورات کے کھانے کے مخصوص لباس میں تھیں اور جن کے شانوں کے گرد شال لپٹی ہوئی تھی اور آج کی تقریب میزبان تھیں۔

"عابد منزل کی تقریبات ایک دوسرے کی پہچان میں بڑی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ وہ سامنے والی میز پر سنہری بالوں والا لڑکا میرا ہی ہے۔ آج سے کچھ ماہ پیشتر میں نے اس کو یہیں پر نئے سال کی تقریب میں دیکھا تھا،" بیگم حامد اللہ اپنی ساتھی خاتون کو بتا رہی تھیں۔

"وہ چھدرے بالوں والے صاحب میرے میاں ہیں،" بیگم کریم بولیں۔

"بالکل ایسا ہی ایک مرد میرے ساتھ بھی آیا تھا اور اس کو میں نے اپنا شوہر تسلیم کر لیا تھا۔ پچھلے مہینے اس الاؤ کے گرد بیٹھ کر اسی لان میں ہماری ملاقات ہوئی تھی جوران بھوننے کے لیے روشن کیے گئے تھے۔ وہ تقریب بھی عابد منزل کی منفرد تقریب تھی۔" بیگم عابد علی میوے کی طشتریاں مہمانوں کے قریب گھماتے ہوئے خود اپنا آپ ظاہر کرنے میں لگی ہوئی تھیں۔ اس وسیع اور عریض میدان میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد یہی ڈھونڈنے اور پانے والا کھیل مختلف انداز میں کھیلا جاتا تھا۔ کبھی صرف ٹھنڈے یخ مشروبات پی کر اور کبھی سوکھی لکڑیوں کے الاؤ روشن کر

کے سارے انسان خود کو پہچاننے کی کوشش میں لگ جاتے۔ ایک سے چہرے اور ایک سے لباس اور ایک سا ہی بول چال کا انداز۔ وہ سب خواتین جو تقریب میں آئی تھیں سب نے باہر سے خریدا ہوا رات کے کھانے کا مخصوص لباس پہن رکھا تھا اور سب کے کندھوں کے گرد لومڑی کی کھال کی شالیں لپٹی ہوئی تھیں... تو کیا وہ سب کی سب بیگم عابد علی تھیں؟ منفرد نظر آنے کی کوشش جو بیگم عابد علی سارے دن کرتی رہی تھیں، وہ بے کار ہی ثابت ہوتی ہوئی نظر آرہی تھی۔

"عابد منزل کی تقریبات میں بڑی جان ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہی سہی، کم از کم ایک دوسرے سے مل تو لیتے ہیں،" وہ جس طرف سے بھی گزرتیں یکساں چہرے ایک ہی آوازیں ایک ہی جملہ کہتے ہوئے انھیں نظر آتے۔

نہ انفرادیت اور نہ منفرد اور مخصوص لباس۔ کیا پہنوں اور کیا نہ پہنوں؟ ان کی کپڑوں کی الماری کے دونوں پٹ چوپٹ کھل گئے اور وہ چیزوں، کپڑوں اور چہروں کے انبار تلے دبنے سی لگیں... وہ ٹہلتی ہوئی میدان میں دوسری طرف نکل گئیں۔ مختلف ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے لوگ بڑے خوش نظر آرہے تھے۔ عابد منزل کی تقریبات کے خوش گوار لمحات کے عکس نے ان کے چہروں کو نکھار دیا تھا۔ وہ سب خوش تھے۔ بیگم عابد علی نے اپنے قریب بھاری قدموں کی آواز کو محسوس کرتے ہوئے نظر اٹھا کر دیکھا۔ عابد علی کسی نووارد کا ہاتھ تھامے ان کی ہی طرف آرہے تھے۔

"یہ ہیں بیگم عابد علی، آج کی تقریب کی میزبان۔" ابھی وہ پورے طور سے خود کو پہچان بھی نہیں پائی تھیں کہ عابد علی یہ کہتے ہوئے انسانوں کے ہجوم میں پھر گم ہو گئے۔

اب مہمان ایک ایک کر کے رخصت ہو رہے تھے۔ گھر کی لمبی راہداری پر کاروں کی تیز روشنیاں جل اور بجھ رہی تھیں۔ بیگم عابد علی وہیں کھڑی دن بھر کی روشنیوں کو ڈوبتے ہوئے دیکھ رہی تھیں۔ جہاں تھوڑی دیر پہلے رونقیں بکھری ہوئی تھیں وہاں اب چاروں طرف دھول سی اُڑ رہی تھی۔ میدان میں پڑی ہوئی کرسیوں پر ان گنت بوسے اور قہقہے آنکھیں موندے پڑے تھے۔ کرسیوں کے نیچے گلاس لڑھک رہے تھے۔ خالی بوتلیں اور چرمرائے ہوئے کاغذ سارے میدان میں بکھرے ہوئے تھے۔ میز پر رکھی ہوئی موم بتیوں کا موم پگھل رہا تھا۔ میوے کی نقشیں کٹوریاں

خالی میزوں پر لڑھک رہی تھیں۔ ساگودانے کی ٹکیاں اور پنیر کا چوُرا رنگین کرسیوں کے گرد بکھرا ہوا تھا۔ میز پر رکھی ہوئی قابوں میں بہت سا ملغوبہ ڈھیر ہوا پڑا تھا ــــ سرخ اور زرد رنگت کا گاڑھا گاڑھا سیال۔ درخت ساکت تھے۔ برآمدے اور راہداری میں رکھے ہوئے گملوں میں پودے مرجھانے لگے تھے۔ مسز منوالا کے گھر کی کھڑکی میں سے ایک سرمئی سر بار بار ابھرتا اور تاریکی میں ڈوب جاتا۔

بیگم عابد علی اپنے شانوں کے گرد لپٹی ہوئی شال کو الگ کرتے ہوئے وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئیں اور آئندہ ہونے والی تقریب کے متعلق سوچنے لگیں۔

عاقبت کا توشہ

کبریٰ دادی کا چل چلاؤ تھا۔

سرخ پتھروں والے چوکور صحن میں کھڑی ہوئی رقیہ کا دل اُمڈا آ رہا تھا۔ اب گھڑی دو گھڑی بعد کبریٰ دادی مر جائیں گی شاید، رقیہ نے سوچا اور اس کو محسوس ہوا کہ وہ کھڑے کھڑے زمین کے اندر دھنستی جا رہی ہے۔ اس نے اپنی ماں کو دیکھا جو ایک دھندلے نشان کی طرح باورچی خانے میں پٹڑے پر بیٹھی ہوئی شوربے کی پتیلی میں زور زور سے کفگیر چلا رہی تھیں۔ کبریٰ دادی کو اماں کے پکائے ہوئے شوربے سے ہمیشہ چڑ تھی۔

"اے دلہن، یہ شوروا ہے؟ نرا پانی!" وہ ہمیشہ رکابی دور سرکا دیا کرتی تھیں۔ پھر اپنے سرھانے سے کوئی پٹلیا یا تلے دانی تلاش کر کے اور روپیہ سوا روپیہ نکال کر کسی کو دیتی تھیں۔

"لے ذرا حلوائی کی دکان سے دہی تو لے آ۔ ہمارے حلق سے یہ موا قیدیوں والا کھانا نہیں اترتا۔" تب رقیہ اور اس کا بھائی بھی کھانے سے ہاتھ کھینچ کر بیٹھ جاتے تھے۔ اماں شوربے کی بھری ہوئی رکابی اور بچوں کو بیک وقت گھورتی تھیں اور پھر بہت سے رنگ ان کے چہرے پر آنے لگتے تھے اور وہ رکابی اٹھا کر باورچی خانے میں چلی جاتی تھیں اور پھر بہت دیر تک برتنوں کو زور زور سے پٹخنے کی آوازیں باورچی خانے سے آتی رہتی تھیں اور اماں کے بولنے کی بھی جن پر نہ کبھی کبریٰ دادی نے دھیان دیا تھا اور نہ بچوں نے۔ وہ سب ایک پلنگ پر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے نوالے بنا کر دہی کے چسکے لگاتے رہتے تھے۔ پھر کسی دن کبریٰ دادی ربڑی منگا لیتی تھیں۔

کبھی مکھن اور شکر سے روٹی کھائی جاتی تھی اور کبھی خدا کی دکان کے کباب اور تکّے۔ اماں نے کبھی بھنا بھر سا سالن پکا کر کبریٰ دادی کو نہیں کھلایا۔ ان کا ایک ہی رونا تھا۔

"کنبے کا گھر ہے اور سات سو روپلّی تنخواہ۔ میں تو جامہ دیکھ کر کپڑا بیوتنے کی قائل ہوں۔ ایک ذرا سی زبان کی چاٹ کی خاطر مفت میں خواری ہوتی پھرے۔"

اور آج بھی، جب کہ کبریٰ دادی صرف چند لمحوں کی مہمان تھیں، اماں باورچی خانے کے پٹرے پر بیٹھی ہوئی شوربے کی پتیلی میں کفگیر چلارہی تھیں۔ اور رقیہ سوچ رہی تھی، اماں بھی اپنی ہٹ کی پکی ہیں۔ صحن اور باورچی خانے سے نظر ہٹا کر اس نے پھر دالان میں دیکھا۔ کبریٰ دادی بڑی دھیمے دھیمے سانس لے رہی تھیں۔ ان کے پورے چہرے پر بڑی ناگواری سے چھائی ہوئی تھی، جیسے اماں کے پکائے ہوئے سالن کی بو ان کے نتھنوں میں گھسی جارہی ہے۔ اس نے اپنے ابا کو دیکھا جو کبریٰ دادی کے سرہانے بیٹھے ہوئے تھے اور بل بل کر قرآن شریف پڑھ رہے تھے اور کبریٰ دادی کہہ رہی تھیں:

"مدبر میاں، یٰسین شریف پڑھو۔ بس اب چل چلاؤ کا وقت ہے۔ مجھے بس ایک ہی فکر ہے۔ بس ایک فکر۔" ان کی آواز بار بار کہیں کھو جاتی تھی اور رقیہ کا دل بھرا چلا آتا تھا۔

"کبریٰ دادی کو جانے کیا فکر ہے؟ کم بخت یہ اکھڑتی سانسیں ان کو پوری بات بھی تو نہیں کہنے دیتی ہیں۔"

وہ جانے کب سے یوں ہی صحن میں کھڑی تھی اور اس وقت کا انتظار کررہی تھی جب کبریٰ دادی کی یہ اکھڑتی اکھڑتی سانسیں ایک دم ختم ہوجائیں گی، ابا رحل اور جزدان میں لپٹا ہوا کلام مجید آتش دان پر رکھ دیں گے اور اماں باورچی خانے سے اٹھ کر اپنی میلی آنکھوں کو پونچھتی ہوئی کبریٰ دادی کی پٹی سے لگ کر بیٹھ جائیں گی اور گھر پر ایک مستقل ویرانی اور سوگ چھا جائے گا۔ پھر کون ہے جو اس کو ختم کرے گا؟ ابا؟ سات سو روپے کی کلرکی اور یہ گلچھرے؟

"قدر کرو بڑھیا کی۔ سونے کی چڑیا ہاتھ لگی ہے مدبر میاں تمہارے!" رقیہ کے کانوں میں نظیر ماموں کی آوازیں آنے لگیں جن کو اپنی سب انسپکٹری اور "کمائی" پر بڑا زعم تھا۔ رقیہ نے اپنی آنکھوں سے ان کو نوٹوں کی گڈیاں لاتے ہوئے دیکھا تھا، جن کو انیسہ مامی نے کبھی ٹھکانے

سے نہیں رکھا۔ یوں ہی کبھی تکیے میں ٹھونس دیے، کبھی پان دان کی کلیوں کے نیچے ڈال دیے۔ بہت کیا تو چلتے چلتے کسی کھلے صندوق کے خانے میں اڑس دیے۔ بیسیوں مرتبہ خود رقیہ ہی سے انیسہ مامی نے ان روپیوں کو صندوق میں رکھوایا تھا۔ ایک ہی گھر تو تھا۔ بس ذرا سی ایک اینٹ کی دیوار بیچ میں تھی۔ ہر وقت کا آناجانا تھا۔ نظیر ماموں کی آئے دن ڈیوٹی لگتی رہتی تھی، کبھی رات کی اور کبھی پورے دن کی۔ جب بھی نظیر ماموں کی رات کی ڈیوٹی ہوتی رقیہ انیسہ مامی کے گھر جا کر سوتی تھی۔ رقیہ کو انیسہ مامی کا لڑکیوں والا لاابالی پن بہت پسند تھا۔ خوانچے پھیری والے تو ان کے دروازے پر ہر وقت بیٹھے رہتے تھے۔ اب ملائی کا برف کھایا جارہا ہے تو اب چھولے کی چاٹ۔ پھر آم والا آگیا تو ڈھیر کے ڈھیر آم تلوا لیے اور بغیر گنتی اور حساب کے کھانے شروع کر دیے۔ بساطی آیا تو سوئی پیچک سے لے کر جھانواں اور ابٹنا تک خرید ڈالا اور پھر ایک آدھ تتلی یا پھول والا پلاسٹک کا کلپ خرید کر رقیہ کے بالوں میں بھی لگا دیا۔ کبھی مکے مدینے والا ہار خرید کے دے دیا اور کبھی سرخ ہرڑوں والا چٹیلا۔ اس نے کبھی بھی انیسہ مامی کو حساب کتاب کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ مٹھیاں بھر بھر کر پیسے وہ یوں ہی بیٹھے بیٹھے خرچ کر دیا کرتی تھیں۔ یہ تو اس کی اپنی اماں ہی تھیں کہ دانت سے پکڑ پکڑ کر ایک ایک پیسہ اٹھاتی تھیں۔ مہنگائی، کھانے ناشتے اور کنبے کی صحت کی فکریں الگ ان کو چاٹے لے رہی تھیں۔ ابا کی تنخواہ میں پورا ڈالتے ڈالتے وہ خود چوتھائی بھی نہیں رہی تھیں۔

"یہ زمانی آپا کوئی ایسی تھیں! اب تو صورت دیکھ کر ڈر لگتا ہے۔ ڈھانچا ہو کر رہ گئی ہیں۔ یہ موٹے تو ان کے بازو تھے،" انیسہ مامی نے ہاتھوں کو خوب چوڑا چوڑا کر کے بتایا تھا اور پھر بولی تھیں:

"طباق سا منھ۔ بارہ من کی دھوبن تو ان کے بھائی نے ان کا نام رکھ چھوڑا تھا۔ سچ، روپے پیسے کی تنگی بہت بری بلا ہے۔"

روپے پیسے کی تنگی کے ذکر پر رقیہ ہمیشہ جھینپ جاتی تھی۔ پھر فوراً ہی اس کو خیال آتا تھا: کبریٰ دادی اور ان کی چھوٹی بڑی پوٹلیاں، تلے دانیاں اور بٹوے۔ ان میں سے ایک تھیلیا تو رقیہ کے لیے بڑی پُراسرار تھی جس کا منھ صرف تیج تہوار یا نذر نیاز کے دن کھلتا تھا۔ کبریٰ دادی بڑی

ٹھسے والی بیگم تھیں۔ رقیہ کو وہ بالکل ملکہ جیسی لگتی تھیں۔ چوڑا چوڑا منہ، پانوں سے سرخ ہونٹ، گالوں کے دونوں طرف جھولتے ہوئے سفید سفید گھونگھریالے بال، کانوں میں اوپر سے نیچے تک سونے کی بالیاں اور ان میں پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے سونے کے پتے۔ پھر کبھی کبھی کبریٰ دادی بالیوں میں موتیا کے پھول پرو لیتی تھیں یا چنبیلی کی کلی لٹکا لیتی تھیں تو رقیہ گھنٹوں کھڑی کھڑی ان کو تکا کرتی تھی۔ اور پھر رہتی بھی ایسی جھک بھق تھیں کہ چھونے سے میلی ہوتی تھیں۔ سفید مری کی کڑھائی کے کرتے کے گریبان میں سونے کے بٹن بڑے قاعدے اور ترتیب سے لگے رہتے تھے۔ مشے کی اطلس کا چوڑی دار پاجامہ اور چھیبسی کی ململ سے کم کا دوپٹہ انھوں نے کبھی نہیں اوڑھا تھا۔ بیوہ تھیں مگر ناک میں پڑی ہوئی کیل بھی انھوں نے نہیں اتاری تھی۔ اس کے علاوہ کلائیوں میں پھنسی ہوئی جہانگیریوں نے ان کو بالکل ملکہ نورجہاں کا روپ دے رکھا تھا۔ اور پھر جب وہ کسی تہوار پر نواڑی پلنگ پر بیٹھ کر دھڑنے سے خرچ کرتی تھیں تو رقیہ کو پکا یقین ہو جاتا تھا کہ ہو نہ ہو کبریٰ دادی پہلے وقتوں کی مہارانی ہیں یا پھر ان کے قبضے میں کوئی جن ہے۔ جن تو ان کے قبضے میں کیا ہوتا، البتہ منشی سلیٹ ضرور ان کے قبضے میں تھے۔ چھوٹے سے قد اور بھدّے نقش والے منشی جی کا نام ان کی سیاہ رنگت کی وجہ سے منشی سلیٹ ہی پڑ گیا تھا۔ وہ کبھی کبھی کبریٰ دادی کے پاس آتے تھے۔ کچھ رجسٹر اور پیلی پیلی کاپیاں سنبھالے جب وہ گھر میں داخل ہوتے تھے تو اماں فوراً پردے میں ہو کر بیٹھ جاتی تھیں مگر دیوار سے کان لگائے ان کی باتیں سنتی رہتی تھیں۔ ان کے جانے کے بعد کبریٰ دادی کی تھیلیا کھلتی تھی اور پھر وہ بہت دیر تک نوٹوں کی الگ الگ گڈیاں باندھ باندھ کر تھیلیا میں ڈالتی رہتی تھیں۔

"یہ عید کے ہیں، یہ بقرا عید کے۔ یہ بڑے پیر پر چادر چڑھوانے کے ہیں اور یہ میاں کی فاتحہ پر خرچ ہوں گے۔" محرم، شب برات اور کونڈوں کی رقم وہ ایک ساتھ رکھ دیتی تھیں۔ باقی بچی ہوئی ریزگاری کے بھی وہ الگ الگ حصے لگاتی تھیں۔

"یہ اندھے حافظ جی کے ہیں۔ یہ میٹھے کنوئیں والے شاہ جی کے۔ یہ جمعرات کے فقیروں کے۔" پھر بچوں کے روز کے خرچے کے پیسے ایک الگ تھیلیا میں ڈال کر ان کو سرہانے رکھ کر اطمینان سے بیٹھ کر چھالیہ کترنے لگتی تھیں۔ رقیہ نے اپنے گھر میں کسی بھی موقع پر تنگی ترشی

نہیں دیکھی تھی۔ کبریٰ دادی کے ہوتے ہوئے اماں کو کاہے کی فکر؟ کوئی خواہ مخواہ اپنے کو فکریں لگا لے تو کیا علاج؟ ورنہ کبریٰ دادی تو ایسے کھلے دل اور کھلے ہاتھ کی تھیں کہ انھوں نے خرچ کرتے ہوئے کبھی سوچا ہی نہیں کہ کیا خرچ کر رہی ہیں۔ پیسے ہوتے ہی خرچ کرنے کے لیے ہیں۔ وہ عید پر زعفرانی سویّوں کے خوان کے خوان مسجدوں اور پڑوس میں بھجوایا کرتی تھیں جن کی خوشبو پوری گلی میں پھیل جاتی تھی۔

گھر میں روز کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا۔ کبھی بڑی گیارھویں ہے تو زردہ پک رہا ہے۔ پلاؤ کی دیگ دَم کی جا رہی ہے۔ اندھے حافظ جی بیٹھک میں بیٹھے ہیں۔ سفید براق چاندنی تخت پر بچھی ہے اور بیٹھک میں عجیب و غریب خوشبوئیں پھیل رہی ہیں۔ لوبان اور اگربتیوں کے دھوئیں میں بل بل کر قرآن شریف کی آیتیں پڑھتے ہوئے اندھے حافظ جی کو نہ پلاؤ نظر آتا تھا نہ زردہ۔ پھر بھی وہ ایسے لمبے لمبے ہاتھ بڑھا کر زردہ پلاؤ کھاتے تھے کہ رقیہ کو کھڑے کھڑے ہنسی آنے لگتی تھی۔ ان کا ہاتھ ہمیشہ اچھی بوٹی اور گرم روٹی پر پڑتا تھا۔ ان کے ساتھ بڑی بڑی سرخ آنکھوں والے شاہ جی بھی کھانا کھاتے تھے، لیکن آنکھیں ہونے کے باوجود وہ ہمیشہ گھاٹے میں رہتے تھے۔ ان کے حصّے میں شاید ہی کبھی اچھی بوٹی آئی ہو۔ اب تو کچھ دن سے انھوں نے کہلا بھیجا تھا کہ ان کا حصّہ کنوئیں پر ہی پہنچا دیا کریں۔

دادا میاں کی فاتحہ کے دن عید کی سی گھما گھمی ہوتی تھی۔ صبح سویرے سے گھر دُھلنا شروع ہو جاتا تھا اور پھر جگہ جگہ طاقوں اور آتش دانوں پر مٹی کے پیالوں میں لوبان ڈال کر رکھ دیا جاتا تھا۔ اگردانوں میں اگربتیاں سلگائی جاتی تھیں۔ شہر کے مشہور نان بائی اور باورچی گھر کے باہر بڑے بڑے چولھے اور تنور بنا کر کھانا پکانے کی تیاریوں میں لگ جاتے تھے۔ اس دن گوشت بھی بازار سے نہیں آتا تھا بلکہ گھر کا تیار کیا ہوا بکرا، جو سال بھر تک اچھوانی اور گھی دودھ پلا پلا کر پالا جاتا تھا، ذبح ہوتا تھا۔ اِدھر اس کے گلے پر چھری پھرتی اُدھر ننھا دہاڑتا:

"موتی، میرا موتی!" اور کبریٰ دادی اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیتیں۔

"بری بات، ننھے۔ دادا میاں کی روح کو تکلیف ہو گی۔" پھر شام کو بیٹھک میں اجلا اجلا فرش بچھتا۔ اس پر چھپا ہوا دسترخوان پوری لمبائی میں بچھایا جاتا۔ کورے گھڑوں پر قلعی کیے ہوئے

کٹورے رکھے جاتے اور گھڑوں کو مچاچج برف سے بھر دیا جاتا۔

"ٹھنڈا یخ پانی تو میاں کی جان تھا۔" کبریٰ دادی برف توڑ توڑ کر گھڑوں کو بھرتی رہتی تھیں۔ کبھی کبھی ان کی آنکھ پر لگے ہوئے چشمے کے شیشے پر کوئی چیز بہنے سی لگتی اور رقیہ سوچتی، "کوئی برف کی کرچی ورچی ہو گی۔" رونے رلانے کے کبریٰ دادی سخت خلاف تھیں۔ خواہ مخواہ مردے کی روح کو تکلیف ہوتی ہے۔ یہ مردے کی روح تو زندوں سے زیادہ زوردار تھی۔ رقیہ کو اچھی طرح یاد تھا کہ جب دادامیاں زندہ تھے تو ذرا بھی تکلیف دہ نہیں تھے۔ بالکل بے ضرر اور معصوم۔ بس خاموش خاموش پلنگ پر لیٹے رہتے تھے۔ رقیہ اور ننھا خوب لڑتے تھے، خوب مار کٹائی کرتے تھے۔ پھر ننھا خوب دہاڑ دہاڑ کر روتا تھا مگر دادامیاں کو پتا بھی نہیں چلتا تھا۔ پھر کھانا بھی تو ذرا سا کھاتے تھے، روٹی کی جھلّی اور ذرا سا شوربا۔ یہ تو اب مر کر وہ اتنے کھاؤ خدا معلوم کیوں ہو گئے تھے کہ کبریٰ دادی سال بھر پیچھے دیگیں پکوا پکوا کر ان کی روح کو خوش کرنے میں پڑی ہوئی تھیں۔ پھر بھی ہر وقت کا دھڑکا:

"کہیں سالن خراب نہ ہو جائے... اصلی گھی کی جگہ ملاوٹ والا نہ آ جائے... فیرنی میں جلے کی خوشبو نہ ہو۔ میاں کو سخت ناپسند تھی۔" پھر شام کو پورا گھر بھر جاتا۔ باہر بیٹھک میں چھوٹے چھوٹے بچے بالکل ایک سے کپڑے اور ایک سی ٹوپیاں پہنے ہوئے ایسے قاعدے اور تمیز سے کھانا کھاتے کہ رقیہ سوچتی:

"ابا ننھے کو بھی اسی اسکول میں داخل کرا دیں۔ کم بخت ایسا ندیدا ہے کہ کھانے پر ہر وقت جان جاتی ہے۔ آخر یہ بچے بھی تو ہیں! کیسے رسان رسان نپے تلے نوالے کھا رہے ہیں! ایک ہمارا ننھا ہے۔ دونوں ہاتھوں سے ایسا لبڑ لبڑ کھاتا ہے کہ جانو سال بھر کا بھوکا ہو۔" پھر وہ اندر دیکھتی۔ صحن میں بچھے ہوئے فرش پر کھانا کھاتے اس کو اپنے تمام رشتے دار بالکل ننھے کی طرح نظر آتے۔ نظیر ماموں اور قربان خالو تو ایسے کھانے پر پلتے تھے جیسے پیدائشی بھوکے ہوں۔ مار مربھکوں کی طرح پلاؤ کھاتے جاتے تھے اور پھر بولتے ہی رہتے تھے:

"خدا مرحوم کی مغفرت کرے۔ اس سے اچھا پلاؤ ہم نے کبھی نہیں کھایا۔"

"اجی مرحوم تھے ہی بڑے شریف اور طرح دار انسان۔ یہی شرافت مرنے پر بھی اپنا اثر

دکھارہی ہے۔"

"صاحب ہم نے ایسا ایسا فاتحہ کا کھانا کھایا ہے کہ ایک نوالہ کھا کر ہی حلق میں گولا سا پھنسنے لگتا ہے۔"

"ارے میاں یہ سب انسان کے اعمال ہوتے ہیں جو ہر ہر طریقے سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ یہ ذرا فیرنی کھا کر دیکھو۔ چمچا منھ میں ڈالتے ہی مرحوم کی نفاست اور خوش گفتاری یاد آ جاتی ہے۔ مجال ہے جو کبھی کسی سے کڑوی بات کی ہو۔ اللہ مجھے معاف کرے، میں نے ہزاروں مرتبہ منھ زوری کی، پھر بھی جب کبھی ملے بڑے کھلے دل اور اخلاق سے۔ واہ واہ، کیا انسان تھے! پھر اللہ ان کی روح کو کیوں شرمانے لگا؟"

اسی قسم کی اور دوسری باتوں میں کھانا ختم ہو جاتا تھا اور رقیہ کو کرید سی لگ جاتی تھی۔ اس دن وہ سارے دن بڑی ٹھہری ٹھہری اور سنبھلی سنبھلی رہتی تھی جیسے زور سے چلے گی تو دادامیاں کا ثابت سالم جسم قبر سے نکل پڑے گا۔ اور ہاں، اگر کھانے پر ناک بھوں چڑھائے گی تو دادامیاں کی روح ساری رات اس کی چارپائی کے گرد ہی منڈلاتی رہے گی۔ اور وہ سوچتی:

"دادامیاں زندہ تھے تو بے چارے کسی کا کیا لے رہے تھے۔ بس خاموش خاموش ایک چارپائی پر ہی پڑے رہتے تھے۔ یہ مرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ سب کو نوچے کھسوٹے کیوں لے رہے ہیں؟" وہ روز کبریٰ دادی کے کانوں میں پڑی ہوئی سونے کی بالیوں کو گنتی تھی۔ چھ جوڑی بالیوں میں سے اب دو جوڑی رہ گئی تھیں۔ اور جہانگیریاں تو ایسی ایکا ایکی کلائیوں سے غائب ہوئی تھیں گویا کسی نے نوچ لی ہوں۔ رقیہ بہت دن تک کبریٰ دادی کی گدر کلائیاں پکڑے دیکھتی رہی تھی۔ جہانگیریوں کے سارے نقش اور پھول ان کی کلائیوں پر چھاپے کی طرح اتر آئے تھے۔ اس کو رونا سا آنے لگا تھا۔ پھر یہ سوچ کر کہ دادامیاں کی روح کو تکلیف ہو گی، وہ صحن میں فرش بچھوانے میں لگ جاتی تھی یا پھر دروازے میں کھڑے ہو کر موٹے نانبائی کو دیکھنے لگتی تھی جو شیرمال لگاتے لگاتے ایسے اُچھلتا تھا جیسے ابھی خود بھی تنور میں جا پڑے گا۔ یہ کوئی ایک دن کی بات تھوڑی تھی۔ کبریٰ دادی کے دم سے روز رقیہ کے گھر میں کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا تھا۔

"اے ہے شب برات کو کیسے حلوا پوری نہ پکے گا! مردوں کی روحیں یوں ہی بھوکی پیاسی

بھٹکا کریں گی! یہ رات تو ہے ہی مردوں کی نیاز نذر کی۔ سارے مردے اس رات قبر سے نکلتے ہیں!"

پھر زندوں کی بھی نیاز ہوتی تھی۔ رجب کے مہینے میں خستہ ٹکیوں سے ابا کے نام کا کونڈا بھرا جاتا۔ دہی بڑوں پر کبریٰ دادی کے نام کی نیاز ہوتی اور چنے کی دال کے حلوے کو ننھے کی پچھلی بیماری کا اُتار سمجھ کر تیار کیا جاتا تھا۔ ننھا بھی پیدائشی مریض، ہر وقت جاڑا بخار چڑھائے بل بلایا کرتا تھا۔ بے چاری کبریٰ دادی کے بہتیرے پیسے تو اس کے سرہانے رکھ رکھ کر ختم ہو جاتے تھے۔ پھر کالی اُرد اور تیل بھری کٹوری جو خیرات کی جاتی تھی وہ الگ۔ اور سال بیچھے رجب کی نیاز کے موقع پر جو حلوے ملیدے میں اضافہ ہوتا رہتا تھا وہ جدا۔ دو تین کونڈے تو ننھے کی بیماری کے اتار کے کبریٰ دادی نے مان رکھے تھے جنھیں وہ بڑی عقیدت سے بھرتی تھیں۔ چنے کی دال کا حلوا، باجرے کا ملیدہ اور خستہ کھجوریں، یہ تین کونڈے مستقل ننھے کے نام سے بھرے جاتے تھے۔ اس دن تخت کے چاروں طرف ننھے میاں ایسی شان سے چکر لگاتے تھے جیسے وہ حضرت میکائیل علیہ السلام ہوں جو ابھی کپڑے سے ڈھکے ہوئے کونڈوں کو کھول کر قحط کی ماری ہوئی مخلوق پر رزق کے سارے دروازے کھول دیں گے۔ ویسے بھی تو اس گھر میں رزق کی بڑی افراط تھی۔ نہ جسم پر بوٹی تھی اور نہ تن پر کپڑے۔ ابا روز ایک ہی اچکن پہن کر دفتر جاتے تھے۔ ان کا کُرتا پاجامہ روز رقیہ کو دھو کر استری کرنا پڑتا تھا۔ اور اماں؟ وہ تو باورچی خانے کی صافی بنی ہوئی تھیں۔ ایک میلی چیکٹ ساری لپیٹے لپیٹے انھوں نے جانے کتنے نذرو نیاز کے کھانے تیار کر ڈالے تھے۔ رقیہ حیران تھی کہ اتنی گندی سی اماں جن کے کپڑوں میں سے ہر وقت لہسن، پیاز اور ہلدی مسالے کی بو آتی رہتی ہے، ایسے زعفرانی اور خوشبودار کھانے کیسے لپا جھپ تیار کر لیتی ہیں!

پچھلے چند مہینوں سے رقیہ محسوس کر رہی تھی کہ گھر میں پہلی والی شان آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ دن سے دادی کبریٰ کی بھی وہ بات نہیں رہی تھی۔ جہانگیریاں اور کانوں کی بالیاں تو ایک ایک کر کے ختم ہو ہی گئی تھیں؛ اب تو بس ایک باریک تار جیسی بالی کان کے سوراخ میں لٹکی ہوئی تھی، وہ بھی شاید اتنی وزنی تھی کہ پورا کان سموسے کی شکل کا ہو کر رہ گیا تھا اور جھولا پڑتا تھا۔ آخر ایک دن جب منشی جی آئے تو کبریٰ دادی نے یہ کہہ کر کہ "پھٹ پڑے وہ سونا جس سے

ٹوٹیں کان!" ان بالیوں کو بھی اتار پھینکا۔ اس دن گھر کا چولہا ذرا روز سے زیادہ تیز جلا تھا اور اماں باورچی خانے کے پٹرے پر بیٹھی ہوئی شوربے کے بجائے کوئی خوشبودار دیگ دم کر رہی تھیں۔ شام کو جب ایک چھوٹے سے ناشتے دان میں کھانا اتار کر کبریٰ دادی نے مسجد میں بھجوایا تب رقیہ کو معلوم ہوا کہ آج دادامیاں کی فاتحہ تھی۔ پورا دن کیسا روکھا پھیکا گزرا تھا۔ نہ صحن دُھلا، نہ چاندنی کا فرش بچھا، نہ کورے کورے گھڑوں پر جگر جگر کرتے گلاس کٹورے رکھے گئے اور نہ اگربتی اور لوبان کی خوشبو پھیلی۔ بس ایک مری مری اور مردہ مردہ سی خوشبو کبھی کبھی باورچی خانے سے اٹھتی اور بیٹھ جاتی تھی۔ رقیہ کا دل ڈوبنے لگا تھا۔ اس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے دادامیاں آج ہی مرے ہوں، جیسے ابھی ابھی اس چھوٹے سے ناشتے دان کے ساتھ گھر سے ان کا جنازہ نکلا ہو۔ تب وہ کھڑے کھڑے رونے لگی تھی۔ وہ گھنٹوں بڑی بڑی سسکیاں بھر بھر کر روتی رہی تھی مگر کسی نے بھی اس کو چپ نہیں کروایا تھا، یہاں تک کہ کبریٰ دادی نے بھی اس کو رونے سے منع نہیں کیا تھا۔ وہ تو جب رات کو سوتے میں وہ دادامیاں دادامیاں کہہ کر روئی تب اماں نے اس کو بلا کر اپنے پاس لٹا لیا تھا۔ پھر بھی وہ ان سے چمٹی کانپتی رہی تھی۔ دادامیاں کی روح کی تکلیف کے خیال سے اس کو سردی سی چڑھ رہی تھی اور یہ ڈر اور خوف اب روز بہ روز بڑھ رہا تھا۔ ایک دن کی بات تھوڑی تھی۔ اب تو سارے دن بڑے رسان رسان آتے اور دبے پیروں چلے جاتے تھے۔ نذر نیاز، فاتحہ درود کا سلسلہ جیسے جیسے گھر کے اندر کم ہو رہا تھا رقیہ کے دل پر خوف و ہراس کے سائے ویسے ویسے گھرے ہوتے جا رہے تھے۔ شب برات کو وہ پوری رات نفل پڑھ پڑھ کر گزار دیتی تھی۔ پانی کے بڑے بڑے چھینٹے مار کر وہ اپنی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کو زبردستی کھولتی تھی اور پھر ہل ہل کر کوئی سورت پڑھنے لگتی تھی۔ اس کو ڈر ہوتا تھا کہ کہیں آنکھ لگ گئی تو سارے بھوکے پیاسے مُردے نکل کر اس کا گلا دبا دیں گے۔ بھلا کہیں چار قتلی حلوے سے اتنے مردوں کو ٹالا جا سکتا ہے! چار قتلی تو انیسہ ماما کا چھ سال کا منا ہی کھا جائے گا جو جب زندہ تھا تو اتنا پیٹو تھا کہ رقیہ کے گھر آ کر سوکھی روٹیاں ہی کھڑے کھڑے کھاتا رہتا اور جس کے پیٹ میں ڈھیروں کیڑے نکلے تھے۔ پھر وہ سوکھتا ہی گیا اور ایسے ہی سوکھ سوکھ کر ایک دن مر گیا۔ انیسہ ماما جب سے ہی دونوں ہاتھوں سے روپے لٹاتی تھیں۔

"ارے ہمیں ان کو جوڑ کر کیا کرنا ہے۔ جب ہمارا منا ہی نہ رہا تو پھر سب بے کار ہے۔"
رقیہ اکثر سوچتی: "انیسہ مامی جو اتنے پیسے فضول خرچ کرتی ہیں وہ کسی کو دے ہی دیا کریں۔"
جب سے کبریٰ دادی بیمار پڑی تھیں تب سے تو رقیہ کو انیسہ مامی کا ایک پیسہ فضول خرچ کرنا برا لگتا تھا اور آج جب وہ اس کو گڑیا کا رانگ کا زیور خرید کر دینے لگی تھیں، جس کی ضد وہ پچھلے کئی ہفتوں سے کر رہی تھی، تو اس نے صاف منع کر دیا اور دل پر جبر کر کے کہہ بھی دیا:
"انیسہ مامی، آپ ہمیں زیور خرید کر نہ دیں۔"
"پھر کیا لے گی؟ ارے تو ہی تو ہفتوں سے میری جان کھا رہی تھی!" انیسہ مامی نے زیور کا چمچماتا پتا بساطی کی چیزوں میں واپس رکھتے ہوئے کہا۔
"وہ... وہ آپ ہمیں..." پھر اس کی آواز حلق میں ہی اٹک گئی۔
"ہاں، بتا، کیا چاہیے؟ اری بول نا! لے، اب مجھ سے بھی شرمائے گی!" انیسہ مامی اس کے سر ہو گئیں۔ پھر بساطی کی چیزوں میں سے ایک ایک چیز اٹھا اٹھا کر اس سے پوچھنے لگیں:
"پنکھیا لے گی؟ یہ دعاؤں کی کتبیا چاہیے؟ لے، پھر سرخی خرید لے۔ اچھا، چل! تار کشی اور کروشیا لے لے۔ اپنے ماموں کے تکیہ غلافوں کی بیلیں بُن دیجو۔" رقیہ یوں ہی گم سم بیٹھی رہی۔ وہ سب چیزیں اس کو بڑی حقیر اور گھٹیا لگ رہی تھیں اور انیسہ مامی بھی، جو جانتے بوجھتے ہوئے بھی کہ اس کو کس چیز کی ضرورت ہے، انجان بنی ہوئی تھیں۔ وہ بساطی کو انیسہ مامی کے دروازے پر بیٹھا ہوا چھوڑ کر اپنے گھر آ گئی اور کبریٰ دادی کے سرہانے کھڑی ہو کر ان کی اکھڑتی سانسوں کو گننے لگی۔

کبریٰ دادی پچھلے تین مہینوں سے بیمار تھیں۔ نہ معلوم کیا بیماری تھی۔ اس بیماری میں ان کی ناک میں پڑی ہوئی کیل بھی، جو سختی سے گوشت کے ساتھ چپکی ہوئی تھی، اماں نے تیل اور چکنائی لگا لگا کر اتار لی تھی۔ ایک تو مرض کی تکلیف، دوسرے برس ہا برس ناک کے ساتھ جمی جمائی کیل کا نکالنا؛ بے چاری کبریٰ دادی کراہ کراہ کر دوہری ہوئی جا رہی تھیں مگر اماں کے چہرے پر ایسی جلادوں والی سختی تھی کہ رقیہ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ان کو پلنگ کی پٹی پر سے دھکا دے دے۔ اور پھر وہ کئی دن تک کبھی اماں کی ناک کو دیکھتی تھی اور کبھی کبریٰ دادی کی ناک کے گول گول سوراخ کو

جس میں سے ناک کا اندورنی حصّہ آرپار دکھائی دیتا تھا۔ کیل نہ اماں کی ناک میں تھی اور نہ کبریٰ دادی کی ناک میں۔ وہ صبح ہی آ کر منشی جی لے گئے تھے۔

ساری چیزیں کیسی ایک ایک کر کے ختم ہو گئی تھیں۔ اب کبریٰ دادی کی وہ مہارانیوں والی شان کہاں تھی! اب تو وہ بچی کھُسٹی چڑیا کی طرح بان کی چارپائی پر پڑی تھیں اور درود شریف پڑھ رہی تھیں۔ بس یہ کلمہ درود ہی تو خالی رہ گیا تھا جس سے ان کی کچھ آس سی بندھی ہوئی تھی۔ وہ بار بار ابا سے کہہ رہی تھیں:

"مدبر میاں، یٰسین شریف پڑھو۔" اور ابا زور سے یٰسین شریف پڑھنے لگتے تھے۔ کبریٰ دادی کے چہرے پر نور ہی نور سا بکھر جاتا تھا۔ ابا کی سناٹے میں پھیلتی ہوئی آواز کے ساتھ ساتھ وہ تیز تیز سانس لینے لگتی تھیں اور پورا چہرہ روشنی والے ہنڈے کی طرح جگمگانے لگتا تھا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ان کو جانے کیا خیال آتا تھا کہ ان کا جھرّیوں بھرا چہرہ شکنجے کی طرح کس جاتا تھا۔ بڑی سختی سی پورے چہرے پر پھیل جاتی تھی اور وہ اکھڑتی سانسوں اور گھُٹی آواز کے درمیان ابامیاں کو مخاطب کرتی تھیں:

"مدبر میاں، فاتحہ درود کا خیال رکھنا۔ یہی زادراہ ہے! یہی عاقبت کا توشہ ہے!"

ابا بڑی بے بسی سے کبھی کبریٰ دادی کو دیکھتے اور کبھی اماں کو جو کبریٰ دادی کی پٹّی کے برابر کھڑی ہوئی ساری کے آنچل میں بندھے ہوئے پیسوں کو بار بار کھول کر باندھ رہی تھیں اور جن کا منھ دروازے کے پٹ کی طرح کھلا ہوا تھا اور گہرے گہرے گڑھوں میں پڑی ہوئی آنکھیں زور زور سے ہچکولے سے کھا رہی تھیں۔ شام کے پھیلتے ہوئے سناٹے میں وہ تینوں رقیہ کو ایسے ڈراؤنے لگ رہے تھے کہ اس کا دل چاہنے لگا وہ سب مر جائیں۔ ابھی اسی وقت تینوں چٹ پٹ ہو جائیں۔ کبریٰ دادی... بچی کھُسٹی چڑیا... لمبے کھوکھلے بانس سے ابا... اور پیڑوں پر رہنے والی چھل پیری سے ملتی جلتی اماں... سب ایک ساتھ ختم ہو جائیں۔ یہ روز روز کا دھڑکا تو جائے گا۔ اس کا دل جو ہر وقت دھڑدھڑ کیا کرتا ہے وہ تو ذرا تھم جائے گا۔ بلا سے پھر ننھا اس کی اکیلی جان کے لیے رہ جائے۔ ذرا روئے گا ہی تو... تو کیا ہوا۔ وہ اس کو انیسہ مامی کو دے دے گی۔ ڈھیروں پیار اور پیسے دے کر وہ اس کو پالیں گی۔ کس چیز کی کمی ہے انیسہ مامی کے پاس؟ یہ بڑا دل اور اتنے بہت سے

پیسے! یہ تو ہمارے ہی گھر پر کسی نے جھاڑو سی پھیر دی ہے۔ چاروں طرف خاک سی اُڑتی رہتی ہے اور اب کبریٰ دادی نے بیمار پڑ کر بالکل قبرستان کی سی فضا پیدا کر دی ہے۔ بے چارے ابا دن بھر جانے کہاں کہاں خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ جب بھی گھر میں آتے ہیں کوئی انگریزی یا یونانی دوا کی شیشی ضرور ان کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اور اماں، وہ اور نسوت پانی شوربا پکا پکا کر خرچ میں پورا اڈالنے کی فکر میں جتی ہوئی ہیں اور ادھر یہ کبریٰ دادی مرنے کے در پر ہیں! مرنے کے بعد کوئی معمولی دھندا ہے! نہلانا دھلانا، کفن دفن۔ پھر قبر کی زمین، سوئم اور فاتحہ درود... یہ سمجھو انسان جیتا ہی مرنے کے بعد ہے۔ اور رقیہ زور زور سے دعا مانگنے لگی: الٰہی کوئی نہ مرے۔ کبریٰ دادی یوں ہی پڑی پڑی کراہتی رہیں اور وہ یوں ہی پکے صحن میں کھڑی کھڑی کانپتی رہے۔ اس نے یہ دعا مغرب کی اذان کے بعد مانگی تھی۔ ذرا سی چوک ہو گئی۔ اذان کے ساتھ ساتھ دعا مانگتی تو فوراً قبول ہوتی۔ یہ اذان کے بعد والی دعا تو یوں ہی پلٹ کر واپس آ گئی تھی۔

ابا نے کبریٰ دادی کی آنکھوں کو ہاتھ سے بند کر دیا۔ اماں نے حلق میں پانی کی بوند ٹپکائی اور سفید چادر سے ان کا جسم ڈھانپ دیا۔ گھر میں سناٹا اور شور ایک ساتھ پھیل گیا۔ ابا اور اماں دیر تک کونے میں کھڑے ہوئے کچھ کھسر پھسر کرتے رہے۔ پھر اماں نے ساری کے آنچل میں سے سارے پیسے کھول کر ابا کی ہتھیلی پر رکھ دیے اور آنکھوں کو پونچھتی ہوئی اندر گھس گئیں۔ مچان پر سے صندوق اتار کر انھوں نے باقی بچے ہوئے پیسے بھی نکال کر ابا کو تھما دیے۔ کبریٰ دادی کے سوکھے مرنڈا جسم کو جب موٹے لٹھے میں لپیٹا جا رہا تھا تو رقیہ زار و قطار رو رہی تھی۔ مشّے کی اطلس اور چھبیسی کی ململ اوڑھنے والی کبریٰ دادی کا ہلکا پھلکا جسم کیسا بوجھل بوجھل سا لگ رہا تھا۔ ابا جب تک قبرستان سے واپس نہیں آ گئے وہ بیٹھی رہی۔ کبریٰ دادی کی روح کی تکلیف کے خیال سے اس کو نیند ہی نہیں آ رہی تھی۔ آج تو خیر چولھا ٹھنڈا پڑا تھا ــــ گھر میں میّت جو ہوئی تھی ــــ مگر سوئم کی فاتحہ؟ ابا اور اماں کا سخت سخت چہرہ اور ہلتے ہوئے ہونٹ۔ رقیہ پلنگ سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ابھی ابھی انیسہ مامی اٹھ کر گئی تھیں اور جاتے جاتے رقیہ سے کہہ گئی تھیں:

"تیرے ماموں کی ڈیوٹی رات کے لیے ہوائی اڈے پر لگی ہے۔ رات کو ادھر ہی آ کر سو جائیو۔"

رقیہ اپنی ماں سے کہتی ہوئی انیسہ مامی کے گھر چلی گئی۔ انیسہ مامی نیند کی ہمیشہ کی کچی تھیں۔ اونگھ سی گئی تھیں۔ رقیہ کی آہٹ پر انھوں نے "ہوں، ہوں،" کی اور ذرا سی آنکھیں کھول کر رقیہ کو دوسرے پلنگ پر لیٹنے کا اشارہ کر کے پھر خراٹے لینے لگیں۔ رقیہ کی آنکھوں میں دور دور بھی نیند کا پتا نہیں تھا۔ وہ بڑی بے چین اور بے کل سی پلنگ پر پڑ گئی۔ تب ابا کی چمگادڑ کی طرح کرسی کے ہتھے پر جھولتی ہوئی خالی اچکن کی جیبیں زور زور سے اس کی آنکھوں کے سامنے ہلنے لگیں اور اماں کی صندوقچی بھی جس کو کھکھوڑ کر ہی رقیہ ادھر آئی تھی۔ ایک خانے میں چھ روپے پڑے ہوئے تھے اور پرسوں سوئم کی فاتحہ تھی۔ رقیہ کا دل پھر دھائیں دھائیں کرنے لگا۔ آج تو وہ کچھ اَور تیزی سے دھڑک رہا تھا جیسے نکل کر باہر ہی جا پڑے گا۔ اس نے آنکھیں پھیلا پھیلا کر چاروں طرف دیکھا۔ انیسہ مامی بے خبر سو رہی تھیں۔ ان کے صندوقچوں والی کوٹھری کے دروازے چوپٹ کھلے ہوئے تھے اور سارے صندوق صاف دکھائی دے رہے تھے۔ رقیہ اپنے پلنگ سے اٹھی۔ اس کا دل اَور زور سے دھڑکا اور وہ پھر پٹی پر بیٹھ گئی۔ اس نے سامنے دیکھا۔ دیوار پر کسی چیز کا سایہ پڑ رہا تھا۔ اور زور زور سے ہل رہا تھا۔ رقیہ کو اچانک کبریٰ دادی کی بے چین روح کا خیال آ گیا۔ وہ پلنگ سے اٹھ کر کوٹھری میں گھس گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد آ کر پلنگ پر لیٹ کر صبح ہونے کا انتظار کرنے لگی۔

جوں ہی اذانیں ہوئیں اور انیسہ مامی نماز کے لیے اٹھیں وہ بھی اٹھ بیٹھی اور اپنی شلوار کے نیفے کو پکڑتی ہوئی اپنے گھر آ گئی اور دیر تک کوٹھری میں گھس کر کچھ کرتی رہی۔ پھر جب وہ کوٹھری سے نکلی تو اس کا چہرہ پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ اس نے سنا، ابا اماں سے کہہ رہے تھے:

"رقیہ کی ماں، سوئم کی فاتحہ کی تم فکر نہ کرو۔ سو سَوا سو روپے میرے صندوق میں بھی ہیں۔ ہاں، چالیسویں کے لیے قرض لینا پڑے گا۔"

یہ کہہ کر وہ اندر چلے گئے اور صندوق کھول کر اپنے روپے تلاش کرنے لگے۔ یہ دیکھ کر وہ حیران رہ گئے کہ ان کے روپیوں کے ساتھ ایک پانچ سو روپیے کا مڑا تڑا نوٹ بھی رکھا ہوا تھا۔ جانے کب کی بھولی بسری رقم تھی جو غیبی مدد کی طرح عین وقت پر ان کو ملی تھی۔ انھوں نے رقم رقیہ کی ماں کو تھمائی اور خود نانبائی کی تلاش میں دروازے سے نکل گئے۔

زبان

وہ گونگوں کی بستی تھی۔ وہاں کے لوگ پیدائشی گونگے نہیں تھے۔ پیدائش کے بعد حاکمِ وقت کے حکم کے مطابق بچے کی زبان تالو سے کھینچ لی جاتی تھی۔ بستی کے بیچوں بیچ کٹی ہوئی زبانوں کی ایک پہاڑی بنی ہوئی تھی۔ پہاڑی کا محافظ ایک باریش بزرگ تھا جس نے کٹی ہوئی زبانوں کا ہار پہن رکھا تھا۔ اس کی آنکھیں چھوٹی اور گول تھیں اور ناک چوڑی تھی۔ بڑے سے دہانے میں سے اس کی بتیسی دور سے نظر آتی تھی۔ وہ ایک اسٹول پر دن بھر خاموش بیٹھا رہتا تھا۔ لوگ کٹی ہوئی زبانوں کے ٹوکرے لالا کر اس پہاڑی پر ڈالتے رہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی سرخ زبانیں ڈھیر میں شامل ہونے کے بعد تھوڑی دیر تک پھڑپھڑاتی رہتی تھیں اور پھر گوشت کے مُردہ لوتھڑے کی شکل اختیار کر لیتی تھیں۔ محافظ کے متعلق کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس کے منہ میں زبان ہے یا نہیں لیکن کسی نے اس کو بولتے ہوئے بھی نہیں سنا تھا۔

اس بستی کے لوگ خوش حال تھے۔ ان کے چہروں پر گونگوں جیسی بےچارگی بھی نہیں تھی۔ وہ دن بھر بغیر بولے ہوئے کام کرتے تھے۔ ان کے کام کی رفتار عام بولنے والے انسانوں کے کام کی رفتار سے چوگنی تھی۔ حاکمِ وقت ایک نوعمر لڑکا تھا۔ وہ صبح کے وقت گشت پر نکلتا تھا اور بستی میں مشینوں اور مویشیوں کی طرح ان گونگوں کو کام کرتے ہوئے دیکھتا تو خاموشی سے گردن ہلاتا ہوا گزر جاتا۔ اس کی اپنی نوگزی زبان تھی جو تین چار بل دے کر کندھے پر پڑی رہتی تھی۔ یہ خاندانی میراث تھی۔ اس سے پہلے اس کے باپ کی بھی اتنی ہی لمبی زبان تھی اور باپ کے

باپ کی زبان کے متعلق بھی یہی بات کہی جاتی ہے۔ یہ دراززبان والاخاندان صدیوں سے اس بستی پر حکومت کر رہا تھا۔ نوعمر حاکم ابھی کنوارا تھا اور فی الحال اس کا شادی کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ وہ بستی میں چند اہم اور ضروری اصلاحات کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ارادہ اس فرسودہ انتظامی ڈھانچے کو بدلنے کا تھا۔ نظام میں تبدیلی کا خیال اس کو اُس وقت آیا تھا جب اس نے محافظ کی لڑکی کو دیکھا تھا۔ چودہ پندرہ سال کی یہ لڑکی زبان نہ ہونے کی صورت میں بھی بے تحاشا بول رہی تھی۔ وہ پہاڑی پر اپنے باپ کے لیے کھانا لے کر آئی تھی۔ کھانا زمین پر پٹخنے کے بعد اس نے اول فول بکنا شروع کر دیا۔ وہ بستی میں رائج شدہ نظام کے خلاف تھی اور حاکم وقت کو اس بھیانک رسم کے مضر اثرات سے خبردار کر رہی تھی۔ تب نوعمر حاکم سفیان کو خیال آیا کہ گدّی سے زبان کھینچ کر بھی اس کو خاموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لڑکی زبان نہ ہونے کے باوجود بھی بول رہی ہے، اور یہ آوازیں عام آواز سے کہیں زیادہ خوف ناک ہیں۔ سفیان نے محافظ سے تازہ کٹی ہوئی زبانوں کے متعلق پوچھا اور محافظ کا اشارہ سمجھ کر وہ پہاڑی کے عقب میں گیا۔ تین چار ٹوکرے کٹی ہوئی زبانوں سے بھرے ہوئے رکھے تھے۔ ٹوکرے میں سے خون رس رس کر زمین پر جمتا جا رہا تھا۔ سفیان تھوڑی دیر خاموش کھڑا ان زبانوں کو دیکھتا رہا۔ دور میدان میں گونگے انسان مختلف کاموں میں لگے تھے۔ کسانوں کے سینے کشادہ تھے اور بازوؤں کی مچھلیاں کام کرتے میں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ سفیان گھنٹوں بستی کے گنجان آباد علاقوں میں گھومتا رہتا۔ اپنے کندھے پر پڑی ہوئی زبان کو کبھی وہ ہاتھ پر ڈال لیتا اور کبھی گردن کے گرد لپیٹ لیتا۔ اس کو اپنی اس زبان سے شدید الجھن ہوتی تھی۔ اس کا ارادہ بارہا اس کو کٹوانے کا ہوا تھا، لیکن یہ خاندانی میراث تھی اور حاکمِ وقت کے لیے دراززبان کا مالک ہونا ضروری تھا۔ سفیان نے اپنی اس گونگی رعایا کو اکثر زبان کے شر کے متعلق بتایا تھا، جب بستی کے لوگوں کے منہ میں بالشت بھر لمبی لمبی زبانیں ہوتی تھیں اور وہ موقع بے موقع چلتی رہتی تھیں اور ان کی ان بے تکان چلنے والی زبانوں کے باعث بستی پر نحوست چھائی رہتی تھی۔ فصل پکنے سے پہلے گل سڑ جاتی۔ کبھی قحط کی نحوست، کبھی بیماری کی لعنت، کبھی جنگ کی ہولناکی اور کبھی قتل اور خون کی آگ... اُن دنوں بستی کے لوگ صرف زبان چلاتے تھے۔ زبان کے اوچھے ہتھیار وہ ایک دوسرے پر آزماتے رہتے اور آپس میں لڑتے رہتے۔ ان کی آپس کی مخالفتیں بڑھتے بڑھتے

خانہ جنگی کی صورت اختیار لیتی تھیں۔ ان دنوں بھی بستی کا حاکم دراز زبان کا مالک تھا۔ خلدوم جو سفیان کے پرکھوں میں سے تھا، اس نے بہت دنیا دیکھی تھی۔ وہ ایک تجربہ کار اور دور اندیش حاکم تھا۔ بستی کی نحوست اس سے دیکھی نہیں جاتی تھی۔ وہ جب انسانوں کو کٹ کھنے مرغوں کی طرح لڑتے ہوئے دیکھتا تو بے انتہا کڑھتا۔ کھیتوں کی طرف نکلتا تو اس کا دل اَور دکھتا۔ پالا ماری ہوئی فصلیں اور دھول اُڑاتی ہوئی زمینیں ہر وقت انسانوں کے نکمّے پن کا رونا سا روتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔

"بستی کے لوگ کام کیوں نہیں کرتے؟" خلدوم نے ایک دن سوچا۔

"بستی کے لوگ بولنے کے موذی مرض میں گرفتار ہیں۔ یہ مرض اس بستی میں وبائی صورت اختیار کر چکا ہے۔ وہ اس وقت تک کچھ نہیں کریں گے جب تک..." خلدوم سوچتے سوچتے ایک دم چونک پڑا۔ اس نے اپنے ملازمِ خاص کو آواز دی جو باہر چند راہ گیروں کو پتھر مار رہا تھا۔ خلدوم کے آواز دینے پر وہ اندر آیا اور بے تکان بولنا شروع کر دیا۔

"خاموش! خاموش!" کہہ کر خلدوم چیخ پڑا۔ اور پھر اس نے آگے بڑھ کر ملازم کی زبان تالو سے پکڑ کر کھینچ لی۔ ملازم کے منہ سے خون کا فوارہ چھوٹا اور خلدوم پر دیوانگی سی طاری ہو گئی۔ اس نے اسی وقت اپنا ذہنی توازن کھو دیا اور اس دیوانگی کے عالم میں ہی اس نے حکم دیا کہ بستی کے تمام لوگوں کی زبانیں تالو سے پکڑ کر کھینچ لی جائیں۔ بستی کے لوگ اس حکم کو سن کر بستی چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بستی میں صرف چند عورتوں کے علاوہ کوئی فرد باقی نہیں رہا۔ ان عورتوں نے کچھ دن بعد تین بچوں کو جنم دیا۔ پیدائش کے بعد بچوں کو خلدوم کے سامنے پیش کیا گیا۔ روتے بلبلاتے بچوں کو دیکھ کر خلدوم پر پھر دیوانگی طاری ہو گئی۔ "لعنت، شر، شر، لعنت!" کہہ کر اس نے ان نومولود بچوں کی زبانیں تالو سے پکڑ کر کھنچوا دیں۔ اس کے بعد سے یہی بستی کا قانون بن گیا۔ بستی کے لوگوں نے زبان کی لعنت سے آزاد ہو کر خوب ترقی کی۔ خلدوم کی وفات کے وقت بستی کی آبادی پہلے سے تین گنا زیادہ تھی۔ یہ گونگے انسان اس وقت مکمل طور سے زبان کے شر سے محفوظ تھے۔ وہ بولنا جانتے ہی نہیں تھے۔ دن بھر مشینوں اور مویشیوں کی طرح کام میں لگے رہتے۔

اب کچھ دن سے بستی میں پھر چہ میگوئیاں سی سنائی دینے لگی تھیں۔ سفیان جب گشت پر

نکلتا تو اس کو اپنے ارد گرد مکھیاں سی بھنبھناتی ہوئی سنائی دیتیں۔ لوگوں کے کام کی رفتار میں آہستہ آہستہ کمی آنی شروع ہو گئی تھی۔ بستی پر قرنوں پرانی نحوست بڑی خاموشی سے آ رہی تھی۔ سفیان حیران تھا۔ بستی میں وہی صدیوں پرانے قوانین رائج تھے۔ انتظامی ڈھانچے کو بدلنے کا خیال اسے آیا تو تھا لیکن اس نے ابھی کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ تب اس نے محافظ کی لڑکی سارہ کو دیکھا۔ لڑکی زبان نہ ہونے کے باوجود مستقل بول رہی تھی۔ اس کی آنکھ، ناک، کان سب کچھ کہہ رہے تھے۔ سفیان کو غصہ بھی آ رہا تھا اور وہ حیران بھی تھا۔ وہ چلتا ہوا پہاڑی کے عقب میں گیا جہاں تازہ کٹی ہوئی زبانوں کے ٹوکرے رکھے تھے اور ان ٹوکروں کے نزدیک کھڑی ہوئی سارہ بے تحاشا ہنس رہی تھی۔ سفیان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر اس نے اپنے اندھے کنویں جیسے منہ کو کھولا اور پھر پاگلوں کی طرح ہنسنے لگی۔ اس کے کھلے ہوئے منہ میں سے کوئی چیز باہر نکلتی ہوئی سفیان کو نظر آئی۔ وہ دیکھنے اور اپنا یقین کرنے کے لیے اس کی طرف بڑھا تو وہ دوڑ کر پہاڑی کے اوپر چڑھ گئی۔ اس کے منہ کے اندر اب بھی کوئی چیز پھڑپھڑا رہی تھی۔ سفیان پہاڑی کے عقب سے سامنے آیا جہاں اسٹول پر گردن جھکائے ہوئے پہاڑی کا محافظ بیٹھا تھا۔ اور تب اس نے گرج کر محافظ کو مخاطب کیا۔ محافظ اسٹول پر بیٹھا بیٹھا بے طرح کانپا اور بولنے کے لیے اپنا منہ کھولا تو تالو کے ساتھ چپکی ہوئی اس کی زبان پہلے نکل کر باہر آ پڑی اور تب محافظ نے کانپتی ہوئی آواز میں سفیان سے کہا کہ وہ بستی کے سب لوگوں کو منہ کھولنے کا حکم دے۔

شام ہونے تک بستی کا ایک ایک فرد سفیان کے سامنے موجود تھا اور بڑھتے اندھیرے میں منہ کھولے کھڑا تھا۔ سفیان یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ان سب کے منہ میں کٹی ہوئی زبان کی جگہ گوشت آہستہ آہستہ بڑھ کر پھر زبان کی صورت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

ابال

فدا حسین کی پہلی بیوی عفت آرا نہ ایسی دھین دھوکڑ تھیں اور نہ بالکل دھان پان۔ رنگت بھی نکھری ہوئی تھی اور نقش بھی خوب تیکھے تھے۔ جسمانی لحاظ سے بھی کوئی عیب نہیں تھا۔ برابر برابر کے چار بچے ماشاء اللہ پہلے ہی تھے اور اب خیر سے پانچواں پیٹ سنبھالے بیٹھی تھیں۔ سب سے بڑا بیٹا نواز تھا۔ وہ اپنی اٹھان اور قدوقامت کے لحاظ سے اپنی عمر سے کہیں بڑا دکھائی دیتا تھا۔ فدا حسین جب بھی اس کو دیکھتے تھے کہتے تھے:

"بیگم تمھارے صاحبزادے جوان ہو رہے ہیں، کوئی لڑکی وڑکی دیکھ رکھو!" اور نواز جھینپ جاتا تھا۔ آمنہ البتہ روگی اور مرگلی سی تھی۔ عفت آرا کا آنچل پکڑے پکڑے پھرا کرتی تھی۔ حالاں کہ اس کے بعد دو چھوٹے بچے اَور تھے مگر ابھی وہی ننھی بنی ہوئی تھی۔ ایک تو گرمی، دوسرے پورے دن؛ عفت آرا کا دل چاہتا تھا کہ بدن کے کپڑے تک نوچ کر پھینک دیں۔ کہاں یہ بچے، کیا سوتے کیا جاگتے، بس جونک کی طرح ساتھ ہی چمٹے رہتے تھے۔ ابھی عفت آرا کے فارغ ہونے میں مہینا سوا مہینا تھا کہ فدا حسین دوسری شادی رچا بیٹھے۔ عفت آرا نے پورے دنوں میں بھی خوب ہمت دکھائی اور خوب چاؤچونچلوں سے چوتھی چالے کیے۔ دلھن کی آمد کے وقت جب وہ بھری پانی کی بالٹی اٹھا کر سیول کرنے کے لیے آگے بڑھیں تو فدا حسین سہرے اور نئی دلھن کے گٹھ جوڑ کو توڑ کر "ارے ارے" کرتے آگے بڑھے اور بولے:

"یہ کیا غضب کرتی ہو بیگم! اگر پیر پھسل گیا..."

"اچھا ہے پھسل..." کچھ کہتے کہتے عفت آرا رک گئیں۔ پھر فوراً ہی سنبھلیں اور بھری بالٹی دلھن کے پیروں تلے لنڈھادی۔ پھر دلھن کو دالان میں پڑے ہوئے تخت پر لاکر بٹھایا۔ ادھر رسمیں ہو رہی تھیں۔ لڑکیاں بالیاں دلہن کو گھیرے بیٹھی تھیں۔ عفت آرا چوبے کی تھالی لینے باورچی خانے میں جو گئیں تو انھوں نے دیکھا کہ صحن کے دوسری طرف فدا حسین سر جھکائے کھڑے ہیں اور اماں بی بڑے کرارے لہجے میں ان کو سمجھا رہی ہیں۔ عفت آرا نے زیادہ سننے کی کوشش بھی نہیں کی۔ اماں بی کی آواز عمر کے ساتھ ساتھ خوب کھردری، کرخت اور مردانہ ہو چکی تھی۔ ویسے بھی خفگی، غصّے، نفرت اور محبت کا ایسا ملاجلا تاثر شامل تھا کہ مجال ہے کوئی ان کی آواز کے سامنے دم مار سکے۔ انسان خاموش کھڑا سنتا رہتا تھا۔ اس وقت بھی وہ فدا حسین سے کہہ رہی تھیں:

"شادی تو تم نے کرلی ہے۔ ٹھیک ہے۔ خدا اور مذہب دونوں اجازت دیتے ہیں۔ مگر اب جو ذمے داری تمھارے اوپر آپڑی ہے، وہ سخت آزمائش ہے۔ یہ بندے کا معاملہ نہیں، اس کے لیے تمھیں خدا کو جواب دینا ہوگا۔ اچھی طرح سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا۔ دونوں میں سے کسی کا دل نہ دُکھے۔ آگے تم سمجھ دار ہو اور تمھاری سعادت مندی سے مجھے اچھی ہی امید ہے۔"

فدا حسین نے دبی زبان میں کہا:

"اماں بی، انشاءاللہ آپ کو کوئی شکایت نہیں ہوگی۔"

فدا حسین نے جو کہا تھا وہ سچ کر دکھایا۔ ہفتے کے سات دن انھوں نے دونوں بیویوں کے درمیان اس قدر مساوی طور پر تقسیم کیے کہ دونوں میں سے کسی کو بھی شکایت نہیں ہوئی۔ پیر، منگل اور بدھ وہ بڑی بیگم، عفت آرا کے ساتھ کوٹھے کے نچلے حصّے میں گزارتے تھے۔ ان تین دنوں میں وہ کوٹھی کے بالائی حصّے اور نشاط دلھن کے خیال کو بالکل ایسا ہی سمجھتے تھے جیسے شیطان؛ حالاں کہ نشاط دلہن کا کچا کچا چہرہ، شربتی آنکھیں، مہندی سے بھرے بھرے ہاتھ اور دلھناپے کی خوشبوئیں اُڑاتا ہوا ان کا گداز بدن بار بار ان کو ورغلاتا تھا۔ وہ عفت آرا کی برابر والی چارپائی پر لیٹے لیٹے بار بار لاحول پڑھ پڑھ کر گھرے گھرے سانس لیتے تو عفت آرا بھی بھنا جاتیں۔

"اوئی توبہ! کیا لاحول کا ورد کر رہے ہو؟ کیا یہاں تمھیں سب شیطان ہی نظر آرہے ہیں؟"

اور فدا حسین جھینپ جاتے اور عفت آرا کے سینے سے چمٹی ہوئی بچی کو الگ کرتے ہوئے کہتے:

"بیگم! بس اب اسے اپنے سے الگ کرو۔ بعد میں اسے اور تمہیں دونوں کو تکلیف ہو گی۔"
حالاں کہ ان کے چہرے سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ اس وقت تو بچی اور اندر ــــ بیگم کے پیٹ کے اندر ــــ کلبلانے والے دلاور حسین، دونوں سے فدا حسین کو تکلیف ہو رہی ہے۔ سخت تکلیف۔ اس وقت کوٹھی کے بالائی حصے کا خیال کچھ اَور شدومد سے اُبھرتا اور نشاط دلھن کا بھی جن کا جنسی شعور بھی ابھی ناپختہ تھا اور جن کے لیے ہفتے کے صرف تین دن، جمعرات، جمعہ اور سنیچر، بہت ناکافی تھے۔ لیکن یہ سخت آزمائش تھی جس کے متعلق سہاگ رات کو ہی اماں بی نے تنبیہ کر دی تھی۔ رہی اتوار، تو وہ فدا حسین باہر گزارتے تھے۔ قوالیوں اور سماع کی محفلوں سے ان کا شوق موروثی تھا۔ سجادہ نشینی اور پیری مریدی باپ دادا کے وقتوں سے ہوتی چلی آئی تھی۔ اماں بی کا کہنا تھا:

"دادا عنایت حسین نے اپنی ساری دولت صرف ایک شعر پر لٹا دی تھی۔ وہ روز رات کو کوٹھے پر جاتے تھے اور وہی ایک شعر پوری رات گوا گوا کر سنتے رہتے تھے۔ صبح کو جب واپس آتے تھے تو ان کی آنکھیں انگاروں کی طرح دہکا کرتی تھیں۔"

باپ دادا کا شوق بس گانے اور وہ بھی غزل، قوالی اور نعتوں تک تھا۔ اس لیے اماں بی کو فدا حسین کی طرف سے بھی پورا اطمینان تھا۔ پھر اب اگلے وقتوں والی دولت بھی کہاں رہی تھی جس کو دونوں ہاتھوں سے لٹاؤ پھر بھی جوں کی توں۔ اب تو یہی کچھ زمینیں اور دکانیں تھیں اور بس ان کی بندھی ٹکی آمدنی۔ یا پھر فدا حسین کی پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ، جس کو اماں بی مہینے کی پہلی تاریخ کو برابر تقسیم کر کے اوپر نیچے پہنچوا دیا کرتی تھیں۔ آخر ان بے چاریوں کا بھی تو کچھ خرچہ تھا اور خرچہ بھی کوئی معمولی نہیں تھا۔ اچھی خاصی رقم تو سال پیچھے زچگی اور جاپے پر اٹھ جاتی تھی۔

نشاط دلھن کے ہاں خدا کی رحمت اَور بھی جوش پر تھی۔ شادی کے پہلے ہی سال دو جڑواں بچے پیدا ہوئے اور پھر سال پیچھے بچے پیدا ہونے کا ایسا تابڑتوڑ سلسلہ شروع ہوا کہ اپنی شادی کے چند سال بعد وہ بڑی بیگم کا مقابلہ کرنے لگیں۔ تن و توش، صورت شکل اور رہن سہن میں تو وہ بڑی بیگم سے سوا ہی تھیں۔ رہے بچے، تو یہ کمی بھی انھوں نے ایسی تیزی سے پوری کی کہ فدا حسین تک گڑبڑا کر رہ گئے اور آخر ایک دن پوچھ ہی بیٹھے:

"اجی یہ سب تمہارے ہی بچے ہیں؟"

"اے لو! تو اَور کیا مانگے کے ہیں!"

"اور یہ پانچ..." فدا حسین حساب کتاب بھی بھولنے لگے۔

"اوئی، کیا ننھے بنتے ہو! یہ سب سوغات تمہاری ہی ہے۔ میں اپنے میکے سے تو ان بلّلوں کو لائی نہیں ہوں!"

میکے سے تو نشاط دلھن واقعی انھیں نہیں لائی تھیں۔ یہ امانتیں فدا حسین کی ہی تھیں جو نشاط دلھن سے سنبھالے نہیں سنبھل رہی تھیں۔ پھر بھی بڑی ہمت والی اور مقابلے کی دھنی تھیں۔ بڑی دلھن کو تو نہ مقابلے کی آرزو تھی اور نہ کسی بات کی حرص۔ اللہ میاں نے خود ان پر اپنی رحمت کے چوطرفہ دروازے کھول رکھے تھے۔ سال دو سال کے دیر سویر سے بیٹا بیٹی میں اضافہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ یہ نشاط دلھن ہی باؤلی تھیں کہ مقابلے کی دُھن میں ایسی دیوانی ہوئیں کہ جان کے بھی لالے پڑ گئے۔ زندگی تھی کہ بچ گئیں ورنہ مرنے میں کوئی کسر تو باقی نہیں تھی۔ بڑی دلھن نے اپنی آنکھوں سے سول ہسپتال کی ڈاکٹرنی کو فدا حسین سے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ڈاکٹرنی کی آنکھوں میں دھمکی تھی اور منھ پر رکھی ہوئی انگلی بالکل تنبیہ والے نشان کی طرح ہونٹوں پر چپکی ہوئی تھی۔ اسی دن سے فدا حسین ذرا سنبھل گئے تھے۔ نشاط دلھن کے ساتھ ان کا وہ پہلا والا جوش و خروش ذرا دھیما پڑ گیا تھا۔ نشاط دلھن اس تبدیلی کو محسوس تو پہلے دن سے کر رہی تھیں لیکن آج جو انھوں نے یہ بچوں والی بات کہی تو بس دھک سے رہ گئیں۔

"بے غوری اور بے توجہی یہاں تک پہنچ گئی ہے!" یہ سوچ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ یہ دیکھ کر فدا حسین اور بھی بوکھلا گئے۔ لاکھ سمجھایا، لاکھ بتایا۔ ساری ڈھکی چھپی باتیں جو صرف کتابوں میں لکھی ہوتی ہیں اور اگر زبان سے کہنے لگو تو حلق خشک ہو جاتا ہے، وہ سب کھول کھول کر بیان کر دیں۔ ڈاکٹرنی اور اس کی دھمکیوں کا حوالہ دیا مگر سب بے سود۔ نشاط دلھن سامان میں ہی نہیں آتی تھیں۔ آخر فدا حسین جب بالکل بے بس ہو گئے تو لاحول کہہ کر آگے بڑھے اور پھر ایک ہی جست میں ساری بندشوں کو توڑ ڈالا اور تب ان کو معلوم ہوا یہ سب خالی خولی گیدڑ بھبکیاں تھیں۔ نشاط دلھن ویسی ہی تندرست اور صحت مند تھیں۔ شربتی آنکھیں اور رس دار

ہونٹ۔ ہاں جسم ذرا بھاری ہو کر لٹک سا گیا تھا، تو کیا ہوا۔

اب پھر گھر کا بھرا پرا آنگن اور تیزی سے بھرنے لگا۔ بچے ایک ساتھ چھوٹے بڑے ہو رہے تھے۔ ان کی عمروں میں کچھ فرق ایسا تھا کہ پتا نہیں چلتا تھا کہ کون بڑا ہے اور کون چھوٹا۔ نشاط دلھن کے تو سب بچے ایسے جڑواں دکھائی دیتے تھے کہ ان کا دل چاہتا تھا سب کو ایک ساتھ چھاتی سے چمٹائے دودھ پلاتی رہیں۔ مگر حق بہ حق دار رسید۔ دودھ پر عارف کا قبضہ تھا اور ایسا غاصبانہ کہ وہ اپنے مورچے سے کبھی غافل نہیں ہوتا تھا۔ ہر وقت ڈٹا رہتا تھا۔ منھ کے ساتھ ساتھ وہ ہاتھ پیروں سے بھی پورا پورا کام لیتا تھا۔ چپڑ چپڑ کرتے ہوئے وہ زور زور سے ہاتھ پیر بھی چلاتا رہتا تھا تاکہ ارد گرد جو غنیم تاک لگائے بیٹھے ہیں وہ ان دھکے مکوں ہی سے ڈر کر بھاگ جائیں۔ جب عارف بہت جوش میں بھر جاتا اور نشاط دلھن کی رگیں دانتوں سے کھنچنے لگتا، ان کی چھاتی میں کبھی دانت اور کبھی کھنی گھسا دیتا تو وہ تڑپ کر باقی بچوں کی کمر پر ایک ایک دھپ جما تیں۔

"ارے کم بختو، تمھیں اور کوئی دھندا نہیں! اس کو چین سے دودھ تو پی لینے دو۔" وہ بے چین ہو کر عارف کو ذرا اور قریب کر لیتیں۔

گھر تھا تو وہ ایسا بھول بھلیاں جس کا اور نہ چھور۔ چلتے چلے جائیے۔ صحن میں بنے ہوئے قدمچوں کی جو قطار شروع ہوتی تو سڑک پر گڑے ہوئے میل فرلانگ کے پتھروں کی طرح ختم ہونے میں ہی نہیں آتی تھی۔ ایک وقت تو آنے والا بھی چکرا کر رہ جاتا تھا۔ الٰہی کب یہ سلسلہ ختم ہو اور وہ ایک کھلا ہوا سانس لے۔ حفظانِ صحت کے سارے اصول ایک ایک کر کے دماغ میں آتے اور وہ چھلانگ لگا کر کمرے میں گھس جاتا۔ وہ وقت عام طور سے ننھے کی ضروریات سے فارغ ہونے کا ہوتا۔ تب بے چارا آنے والا بوکھلا کر بڑی دلھن کی شی شی کے درمیان ہی جلدی جلدی سانسیں لینے لگتا اور تب ہی بڑی دلھن کہتی تھیں:

"اے ایسے کیا ہوائی گھوڑے پر آئے ہو! ذرا بیٹھو۔ ننھا فارغ ہو لے تو تمھیں اصلی زردے والی گلوری کھلاؤں گی۔"

ابھی ان لوگوں کو اصلی اور نقلی کی تمیز تھی۔ تمیز نہ ہوتی تو بڑے ابا یوں ہی ایسے پُرفضا

مقام پر مکان بنواتے! زندگی اور بات چیت میں بڑے ابا کبھی اعتدال کے قائل نہیں تھے۔ ان کے فیصلے ہمیشہ دو ٹوک ہوتے تھے ــــ ادھر یا اُدھر۔ مکان بنواتے وقت سب نے مخالفت کی تھی:

''اے کیا عقل ماری گئی ہے؟ بھائی! کچھ تو سمجھ سے کام لو۔ کیا اللہ میاں کے پچھواڑے مکان بنوا رہے ہو۔ پھر آب ہوا بھی تو دیکھو۔'' وہ جانتے تھے کہ بڑھتی عمر میں کس ماحول اور کس آب و ہوا کی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے انھوں نے شہر سے بہت دور اور آبادی سے الگ تھلگ اپنا مکان بنوایا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ انھوں نے اپنے خاندان کی بڑھتی ہوئی آبادی کا بھی پورا پورا خیال رکھا تھا۔ کوٹھی الگ الگ چار حصّوں میں تقسیم تھی جو بیک وقت الگ بھی تھے اور ایک بھی۔ یہی وجہ تھی کہ اب، جب بڑے ابا مر کھپ بھی گئے تھے، کوٹھی میں سب بڑے سکون سے رہتے تھے۔ سب الگ الگ بھی تھے اور ملے ہوئے بھی۔ چولھا ہمیشہ سے ایک رہا تھا اور وہ اب بھی ایک تھا۔ پہلے وہ بڑی اماں کے حصّے میں تھا، اب اس پر اماں بی کا قبضہ تھا۔ بہو بیٹیوں کے لیے اَور سینکڑوں دھندے تھے ــــ چولھے چکی سے انھیں کیا واسطہ۔ پھر چھوٹے چھوٹے بچے، گُو موت اور پاکی ناپاکی۔ ذرا ذرا بات سے تو ایمان خراب ہوتا ہے۔ یہ سب اماں بی کو اچھی طرح معلوم تھا۔ ان کو پورا بہشتی زیور حفظ تھا جسے پڑھنے کی ہدایت وہ نشاط دلھن اور بڑی دلھن کو بھی کرتی رہتی تھیں:

''بیبیو، خود بھی پڑھو اور بچیاں بڑی ہو رہی ہیں، ان کو بھی پڑھاؤ۔ ناپاکی بڑا گناہ ہے۔''

نشاط دلھن اور بڑی دلھن کا دن بھر تو گو موت دھوتے دھوتے گزر جاتا تھا۔ جو کسر رہ جاتی تھی وہ رات کو پوری ہو جاتی تھی۔ اس لیے ان کے ذہن سے پاکی ناپاکی کا فرق سرے سے مٹ گیا تھا۔ اماں بی کی بات کو وہ بڑھاپے کی بڑ سمجھ کر ٹال جاتی تھیں اور پھر ایک دوسرے کو کنکھیوں سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی رہتی تھیں۔

گھر ایک کھلی ہوئی اسٹیج کی طرح تھا جس پر بچے بڑے ایک ساتھ اوندھے سیدھے کھیل کھیل کر قبل از وقت جوان اور بوڑھے ہو رہے تھے۔ تماشائیوں میں صرف ایک اماں بی تھیں۔ ادھر دوڑتیں تو اُدھر کا کھیل کلائمکس پر پہنچ جاتا۔ ادھر آتیں تو دوسری طرف ڈراما اپنی آخری ہچکیاں لیتا ہوا دم توڑ دیتا تھا۔ اور وہ سر پر دو ہتڑ مار کر بند دروازے کے سوراخوں میں سے جھانکتے ہوئے بچوں کی درجن بھر فوج کو لا کر آتش دان کے پاس بٹھا دیتی تھیں اور پھر کہانی شروع ہو جاتی

تھی۔ اور جب سورج نکلتا اور دن آہستہ آہستہ گرم ہونا شروع ہوتا تو سب بچے باہر نکل آتے اور کھیلنا شروع کر دیتے۔ عائشہ پیڑ کے پیچھے دونوں ہاتھوں سے آنکھوں کو بند کر کے کھڑی ہو جاتی تھی۔ پھر سب کی ملی جلی آوازیں آتیں: "آجاؤ!" وہ آنکھیں کھول کر باری باری سب کی کمر پر ہاتھ مارتی اور پھر آنکھیں بند کر کے کھڑی ہو جاتی تھی: "میں پھر چور بنی جاتی ہوں۔" وہ سب کی باری میں چور بننے کو تیار رہتی تھی۔ آنکھ مچولی والے کھیل کو اس نے بھول بھلیاں بنا دیا تھا۔ چور کا پتا ہی نہیں چلتا تھا اور چوروں کا یہ پورا گروہ دن کے اجالے اور رات کی تاریکی میں چھاپا مارنے کی فکر میں لگا رہتا تھا۔ گھر کے بڑے آدمیوں کو معلوم بھی نہیں تھا کہ وہ سب چپکے چپکے کیا چرا رہے ہیں۔ وہ ایسی لمبی تان کر سوتے تھے کہ چاروں طرف کچھ بھی ہوا کرے ان کو خبر نہیں ہوتی تھی۔ آنکھ کھلتی بھی تو اس وقت جب ایک ایک کر کے پورے کا پورا گروہ دروازے سے نکل جاتا تھا اور پھر کوٹھی کے پچھلے حصے میں جا کر بالکل اسی طرح سونے کی مشقیں کرتا جیسے گھر کے اندر والے سوتے تھے۔ مگر نیند ان کی آنکھوں میں کہاں تھی۔ نیند صرف امیوں اور ابا کا حصہ تھی۔ ان میں سے بہت سوں کی آنکھیں تو نیند سے سرے سے ناواقف تھیں۔ ان کی آنکھوں کے پٹ ہر وقت بھاڑ سے کھلے رہتے تھے۔ دوپہر کو اماں بی ان سب کو زبردستی کمرے میں بند کر کے لٹاتی تھیں اور پھر بار بار نماز کی چوکی پر سے اٹھ اٹھ کر ان کو دیکھتی تھیں۔ ان سب کی کھلی ہوئی آنکھوں میں ایک التجا ہوتی تھی؛ بالکل مجرموں والا احساس جو جرم سے تائب ہونا چاہتا ہے مگر بے بس ہے۔ گناہ کی لذت! جرم کیے بغیر چارہ بھی تو نہیں۔ اماں بی ان کی تپتی پیشانیوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر ایک ایک کو سمجھاتی تھیں:

"دوپہر کا وقت ہے۔ کہاں مارے بدارے پھرو گے! بس اب اس وقت سو جاؤ۔ شام کو نہا دھو کر کھیلنا۔ اچھے اور شریف بچوں والے کھیل۔"

تب وہ سب باری باری ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور پھر ان کو اپنے وہ سب کھیل ایک ایک کر کے یاد آتے رہتے تھے جو وہ گھنٹوں بڑوں سے چھپ کر مگر بالکل بڑوں کے انداز میں کھیلا کرتے تھے۔ کوئی امی بنتا اور کوئی ابا۔ کوئی ڈاکٹر اور کوئی ڈاکٹرنی۔ بچہ ہمیشہ عائشہ کے ہوتا تھا جو بہت سا گودڑ بھر کر اپنے پیٹ کو بالکل نشاط دلھن کی طرح پھلا لیتی تھی اور پھر چلتی بھی بالکل ان کی

طرح تھی۔ چنو اور فوزیہ جو ابھی بالکل ناسمجھ تھے اور جن کو کھیل میں شامل نہیں کیا جاتا تھا، اکثر انتہائی نازک موقعے پر آ کر کوئی کھنڈت ڈال دیتے تھے۔ ایسا ہی کوئی موقع تھا۔ ڈاکٹرنی اپنے اوزار اور ہتھیار سنبھالے تیار کھڑی تھی۔ عائشہ تکلیف سے کراہ کراہ کر دوہری ہوئی جا رہی تھی۔ نواز ڈھیلی ڈھالی اچکن پہنے ہوئے بالکل ابو کی طرح گھبرا گھبرا کر درود شریف پڑھ رہا تھا کہ چنو اور فوزیہ دوڑتے ہوئے آئے اور ہانپ ہانپ کر کہنے لگے:

آمنہ باجی، نواز بھائی، شیریں آپا اور اے عائشہ کی بچی، بس اب یہ اپنا کھیل ویل بند کرو۔ ہم نے ابھی دروازے کے سوراخ میں سے جھانک کر دیکھا ہے۔ ہمارے اباجی کو بڑا بل بلا کر بخار چڑھ رہا ہے۔" نواز نے آمنہ کو دیکھا جو ہمیشہ کی طرح بالکل بے تعلق اور منجمد سی کھڑی تھی، جیسے کہہ رہی ہو: "ہنھ، اباجی کے بخار کا کیا ہے! دن میں جانے کتنی مرتبہ چڑھتا اترتا ہے۔"

مگر نواز جلدی جلدی پلکیں جھپکا رہا تھا۔ وہ ستے ستے چہرے سے کبھی فوزیہ کو دیکھتا اور کبھی چنو کو۔ چھپکلی کی شکل سے ملتے جلتے یہ زرد زرد رنگ والے بچے آخر بڑے کیوں نہیں ہوتے؟ اچھی اور کھلی آب و ہوا میں سب ٹھٹھرے کیوں جا رہے ہیں۔ پھر اس کے کانوں میں سے سیٹیاں سی نکلنے لگیں اور اپنے مختصر ڈیل ڈول کے باوجود وہ خود کو بہت بڑا محسوس کرنے لگا۔ اس نے آگے بڑھ کر ایک ایک چانٹا ان دونوں کے گالوں پر مارا اور بولا:

"خبردار جو اب تم نے کبھی ابا کے کمرے میں جھانکا!"

بچوں نے نفرت سے نواز کو دیکھا۔ سبق حرف بہ حرف صحیح سنانے کے بعد بھی استاد ان کو دھمکا رہا تھا۔ ان کے ننھے ذہنوں میں الجھٹے ہی الجھٹے پڑتے جا رہے تھے۔ باریک باریک دھاگوں کا جال تھا جو سلجھائے نہیں سلجھتا تھا۔ گھر میں نہ کسی کو فرصت تھی اور نہ وقت۔ وہ سب سہمے سہمے پورے گھر میں بدروحوں کی طرح بھٹکتے رہتے تھے۔ فدا حسین، بڑی دلھن اور نشاط دلھن کو جب بھی موقع ملتا تھا وہ ان سب کو دیکھتے ضرور تھے اور تھوڑی دیر کے لیے فکرمند بھی ہو جاتے تھے:

"کیا قحط کے مارے ہوئے بچے ہیں۔ ماشاء اللہ اچھا کھاتے پیتے ہیں مگر نہ بوٹی چڑھتی ہے اور نہ ہڈی بڑھتی ہے۔"

"نمک حرام ہیں سسرے۔ سب کھلایا پلایا بیکار جا رہا ہے۔ وہ ذرا ولی عہد بہادر کو تو دیکھیے!

کیا یتیموں اور مجرموں کا ملا جلا مرکب ہیں!" فدا حسین کونے میں کھڑے ہوئے نواز کو دیکھ کر کہتے جو
متواتر پلکیں جھپکاتا رہتا تھا۔

"اے اس کو چھوڑو، لڑکا ہے، بیس بائیس سال تک بڑھتا ہے۔ مجھے تو لونڈیا کی فکر ہے۔
ذرا اس آمنہ کو دیکھو۔ ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک جاؤ تب بھی کپڑوں میں اس کا جسم نہیں ملے گا۔"

"تمھیں اسے لیڈی ڈاکٹر کو دکھانا چاہیے،" فدا حسین نے فکر مندی سے کہا۔ آمنہ واقعی
غیر معمولی حد تک مختصر تھی۔

"اوئی توبہ! کنواری لڑکی کو لیڈی ڈاکٹر کو دکھاتی پھروں گی! تمھاری تو عقل ماری گئی ہے۔"

"پھر؟" فدا حسین کا منھ کافی دیر تک کھلا رہا۔

"تمھیں کیا فکر لگ گئی؟ اماں بی سے کہوں گی کوئی جڑی بوٹی دے دلا دیں گی۔ لونڈیا سہم گئی
ہے۔"

"سہم گئی ہے؟ کوئی ننھی تھوڑی ہے۔ خیر سے پندرھویں برس میں ہے!"

آمنہ پندرھویں سال میں تھی!

تینوں نے آمنہ کو ایسے دیکھا جیسے پہلی مرتبہ دیکھ رہے ہوں اور پھر سچ مچ پریشان ہو گئے۔
ان کے چہروں پر ہوائیاں سی اُڑنے لگیں۔ انتہائی بے بسی والی کیفیت تھی، جیسے کانوں سے
خطرے کا الارم سننے کے بعد بھی بھاگنے سے معذور ہوں۔ مختصر اور منجمد سی آمنہ ایسی بیڑی تھی جو
بیک وقت ان تینوں کے پیروں میں آ پڑی تھی۔ پھر ان تینوں نے خوب ہاتھ پیر مارے، ادھر
اُدھر نظریں دوڑائیں۔ نشاط دلھن اور بڑی دلھن نے اپنی ذاتی دشمنیاں بھول کر زری اور گوٹے لچکے
کے درمیان سہاگ گانے شروع کر دیے۔ اماں بی نے ان دونوں کو کوٹھری میں لے جا کر سمجھا دیا
تھا۔

"جو کام مل جل کر ہوتا ہے وہ بے کِل کِل سے نہیں ہوتا۔ تمھارے آپس کے جیسے
تعلقات ہوں وہ جدا بات ہے۔ یہ لونڈیا کا معاملہ ہے وہ جیسی بڑی دلھن کی ویسی نشاط دلھن تمھاری۔
اور پھر آج آمنہ ہے تو کل شیریں۔ ماشاء اللہ دونوں برابر کی ہیں۔ مل کر پہلے ایک کا جہیز تیار کر
لو،" انھوں نے ایسی رازداری سے کہا جانو دولہا دروازے پر ہی کھڑا ہو۔ اور پھر خود کھانے ناشتے کی

فکر میں لگ گئیں؛ معلوم نہیں کس وقت لڑکے والے آ جائیں اور ہڑبونگ مچتی پھرے۔ تو چل میں آیا۔ جلدی جلدی میں ویسے بھی اماں بی کے ہاتھ پیر پھول جاتے تھے۔ وہ بڑے اطمینان اور سکون سے کام کرنے کی قائل تھیں۔ ایسے ہی سکون کی تلقین ایک دن فدا حسین نے اماں بی کو کی تھی جب آمنہ کی لگی لگائی بات لڑکے والوں نے توڑ دی تھی اور کہلا بھیجا تھا:

"لڑکی اور ماں میں کچھ تو فرق ہونا چاہیے۔ لڑکی کے چہرے پر تو ایسا پکا پن ہے جیسے آٹھ بچوں کی ماں وہی ہو۔"

تب پھر ایک ساتھ بہت سی آنکھوں نے آمنہ کو دیکھا تھا اور آمنہ دنوں کونے میں منہ دیے روتی رہی تھی۔ اتنی مختصر اور بے ضرر سی لڑکی ایکا ایکی آٹھ بچوں کی ماں کیسے بن گئی؟ اب وہ گھنٹوں آئینے کے سامنے کھڑی اپنے چہرے کو ٹٹولتی رہتی تھی۔ چہرہ ایک غار تھا، اندھیرا اور گہرا کھڈ... یا بند کمرہ جس میں ڈھیروں بھید بھرے ہوں۔ ان ہی بھول بھلیاں میں پھنس کر بارات بار بار راستہ بھول جاتی تھی۔ نشاط دلھن، بڑی دلھن اور فدا حسین سب پریشان تھے، کہ اماں بی نے ایک دن نادر شاہی حکم جاری کر دیا:

"بس خبردار! رات کی جدا بات ہے۔ مگر دن میں فدا حسین تم اِدھر باہر بیٹھک میں اپنا انتظام کرو۔ غضب خدا کا، بچے جوان ہو رہے ہیں اور تمہارے چاؤ چونچلے ہی ختم نہیں ہوتے!"

نہ جانے کون سی جوانی کا اماں بی کو انتظار تھا۔ اس گھر میں تو چاروں طرف بڑھاپا ہی بڑھاپا رینگ رہا تھا۔ خالص تجربہ کار بوڑھوں والا بڑھاپا جس میں برف کا ٹھٹھراؤ اور سردیوں کی خنک راتوں کا سناٹا۔ اماں بی کا دم گھٹا جاتا تھا۔

"الٰہی ان بچوں کو کیا روگ لگ گیا؟" وہ ڈھیروں گھی پتیلی میں لنڈھا دیتی تھیں۔ آب جوش اور یخنی بگھار بگھار کر نواز کو پلاتی تھیں۔

"اے ہے، پڑھنے لکھنے والے جوان لڑکے کہیں ایسے ہوتے ہیں! میاں کیا مرغی کا چگا کھاتے ہو؟ لو، یہ شوروا لو۔" وہ گہری بھرے شوربے کی رکابی نواز کی طرف بڑھاتیں۔ مگر نواز سوکھتا ہی جا رہا تھا۔ اس کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ جیسے بڑھتے بڑھتے ایک دم ٹھٹک کر رہ گیا ہے۔ آنکھوں میں کھوجی پن اور بہت کچھ معلوم کرنے کی خواہش پلکوں کو ایک جگہ ٹھہرنے ہی نہیں

دیتی تھی۔ وہ مستقل پلکیں جھپکاتا رہتا تھا جیسے اس نے جو کچھ دیکھ لیا ہے وہ یا تو بہت زیادہ ہے یا بہت کم۔ ایک پیاس اور بے چینی سی تھی جو اس کی کھلتی بند ہوتی آنکھوں سے ٹپکتی رہتی تھی۔ وہ رات کو بار بار اپنے پلنگ سے اٹھتا اور پورے گھر میں گھومتا تھا۔ سب کی چارپائیوں کے گرد جا جا کر دیکھتا۔ چنو فوزیہ ایک دوسرے کی ٹانگوں میں ٹانگیں اڑائے بڑے بے ڈھنگ طریقے سے سوتے رہتے تھے۔ آمنہ اپنے پلنگ پر لیٹی لیٹی بار بار کروٹیں بدلتی تھی۔ اس کے پلنگ کی چولیں رات کے وسیع سناٹے میں بڑے احتجاجی انداز سے چرچراتی تھیں تو نواز اس کے سرہانے جا کر کھڑا ہو جاتا تھا اور بڑے پیار سے پوچھتا تھا:

"کیوں، آمنہ بی بی! تمھیں نیند نہیں آ رہی ہے؟ پانی لا دوں؟" آمنہ پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ جاتی تھی۔ اپنی ٹانگوں سے بندھا ہوا دوپٹہ کھول کر دونوں ٹانگوں کو پھیلا کر خوب زور زور سے کھینچتی اور کہتی:

"بڑا درد ہے اور بڑی اینٹھن سی ہو رہی ہے۔"

"تم سونے کی کوشش کرو بی بی، دیکھو ایک بج رہا ہے!" نواز اس کو سمجھاتا۔ ایسے ہی ایک دن جب وہ رات کو جاگ رہا تھا، گھوم گھوم کر چاروں طرف دیکھ رہا تھا، اس کو زینے سے کسی کے اترنے کی آواز آئی۔ وہ کونے میں دبک کر کھڑا ہو گیا۔ تب اس نے دیکھا نشاط امی، بالکل ان سب کی طرح، بڑی امی کے کمرے کے دروازے کے سوراخ میں آنکھیں گاڑے کھڑی تھیں۔ نواز سر سے لے کر پیر تک کانپنے لگا، اس کے دانت بجنے لگے۔ اسی وقت آمنہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی اور نواز کو کمرے میں کھڑا دیکھ کر بولی:

"بھائی جان، تم سردی میں یوں ہی کھڑے ہو؟ آؤ، میرے لحاف میں آ جاؤ۔" اس نے سرک کر تھوڑی سی جگہ خالی کر دی لیکن نواز یوں ہی کھڑا کھڑا کانپتا رہا۔

صبح کو گھر کی عدالت میں فدا حسین کی وہ تھڑی تھڑی ہوئی کہ سب کو ان پر رحم آنے لگا۔ نشاط دلھن خوب دہاڑیں:

"ہوں، تو یہ نعتوں اور قوالیوں کا ڈھونگ رچا کر یوں میری آنکھوں میں دُھول جھونکی جا رہی تھی! میں بھی تو کہوں ایسے دین دار کب سے ہو گئے؟ ہر اتوار نعت، ہر اتوار قوالی۔ یہ تو مجھے آج

ہی پتا چلا کہ ہاتھی اتوار کو یہیں کمرے میں جھومتا ہے۔"

وہ خوب ہاتھ چلا چلا کر بول رہی تھیں۔ بڑی دلھن مسکرا رہی تھیں۔ بڑی معنی خیز سی مسکراہٹ ان کے پورے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔ فدا حسین سٹ پٹا کر اندر باہر آجا رہے تھے کہ اماں بی دالان سے اٹھ کر صحن میں آگئیں اور بولیں:

"دلدّر مارِیو، تمھارا کچھ ٹھکانا ہے! اری اندھیو، اس کو دیکھو! تمھاری روز کی ہے ہے کِل کِل نے اس کا کیا حال بنایا ہے۔ اس میں کہاں دَم رکھا ہے! کھنڈر تو ہو گیا ہے غریب۔" یہ کہتے کہتے ان کی آواز حلق میں اٹک گئی اور وہ دوپٹے کے آنچل سے آنکھیں اور چشمہ پونچھتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ گھر میں پھیلا ہوا شور کونوں بچالوں میں ڈوب گیا۔ فدا حسین مستقل بیٹھک میں رہنے لگے۔ بیٹھک کے بالکل سامنے اماں بی کا نواڑی پلنگ بچھ گیا۔ اب اماں بی پہرے دار کی طرح ہر وقت چوکس رہتی تھیں۔ پتا بھی کھڑکتا تو وہ چونک پڑتی تھیں۔ خراٹوں کی آواز "ہوں، ہوں،" میں تبدیل ہوتی اور پھر آیت الکرسی کا ورد اور توبہ استغفار کرتی ہوئی وہ پلنگ پر بیٹھ جاتی تھیں۔

"کیا بات ہے میاں؟ اتنی رات گئے تک جاگ رہے ہو۔"

"وہ... وہ اماں بی... پانی..." فدا حسین کے زینے کی طرف اٹھتے ہوئے قدم رک گئے۔

"پانی؟ میاں، میں نے بیٹھک میں صراحی بھروا کر رکھوا دی ہے۔ یا بھول گئی ہو گی آمنہ۔" یہ کہہ کر وہ پلنگ سے اٹھ گئیں اور بیٹھک میں جا کر فدا حسین کو آواز دی۔

"اے لو، یہ کیا! رکھی تو ہے صراحی۔ لو، پانی پیو۔" انھوں نے پانی کا بھرا ہوا گلاس فدا حسین کو پکڑاتے ہوئے کہا۔ پانی کے کڑوے گھونٹ حلق سے اتارنے کے بعد فدا حسین پلنگ پر لیٹ گئے۔

اور کسی رات وہ پھر بے چین ہو جاتے۔ کروٹوں پر کروٹیں لے لے کر گزرتی رات کا ایک ایک پل گنتے رہتے اور جب رات انتہائی خاموش اور گہری ہو جاتی، اماں بی کی خراٹوں کی آواز بھی اندھیرے میں ڈوب جاتی، تب وہ اپنے پلنگ سے اٹھتے اور ننگے پاؤں آہستہ آہستہ سائے کی طرح دیوار کے سہارے رینگتے ہوئے بڑی دلھن کے کمرے تک پہنچ جاتے۔ پھر دروازے پر ہلکی سی دستک دیتے کہ نواز چونک پڑتا اور اپنا پلنگ چھوڑ کر چور چور کہتا ہوا اماں بی کے سرہانے کھڑا ہو کر

گھگیانے لگتا۔ اماں بی "ہوں، ہوں،" کرتی ہوئی پلنگ سے اٹھ جاتیں، اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر جوتے تلاش کرتیں۔ پھر ایک ایک کمرے کی بتی جلا کر دیکھتیں:

کہاں دھرا ہے چور؟" وہ بیٹھک میں سوئے فدا حسین پر چادر ڈال کر اپنے پلنگ پر آ کر لیٹ جاتی تھیں۔

اب اماں بی ہر طرف سے مطمئن تھیں۔ "یہ روز کی ٹکا فضیحتی تو ختم ہوئی۔ دونوں کی دونوں مل کر لونڈے کو کھائے جا رہی تھیں۔ اب دیکھو ذرا سی نگرانی کی ہے اور لونڈے کے گالوں پر سرخی اتر آئی ہے۔" وہ بڑے دُلار سے فدا حسین کو دیکھ کر سوچتیں۔ فدا حسین کو واپس زندگی کی طرف لانے میں اماں بی کو بڑی دھینگا مشتی کرنی پڑ رہی تھی۔ بڑی دلھن اور نشاط دلھن دور سے بیٹھی بیٹھی کھا جانے والی نظروں سے ان کو گھورا کرتی تھیں۔ غصّہ اور نفرت سانپ کی پھنکار بن بن کر ان کی آنکھوں سے نکلتا تو ایک وقت اپنے صحت مند ڈیل ڈول کے باوجود اماں بی بھی سہم جاتی تھیں، مگر سوچتی تھیں:

"ان کا کیا ہے۔ ناعاقبت اندیش ہیں کمبختی ماریاں! بھلا ذرا ذرا سے بچے ہیں۔ بچوں کو باپ کی ضرورت ہے، صحت مند باپ کی۔ یہ تو موئی دیوانیاں ہیں۔ اب یہ بات بھی مجھے ہی بتانی پڑے گی ان بے عقلوں کو۔"

اور پھر ایک دن موقع محل دیکھ کر انھوں نے کہہ ہی دیا:

"بیبیو، دل سے لگاؤ تو تمھارے لیے اَور ہزاروں فکریں ہیں۔ چھوٹے بڑے بچوں کا ساتھ ہے۔ ذرا لونڈے کو دیکھو۔ اے بڑی دلھن، تم نے نواز کو دیکھا؟ جانے ڈوبے کو کیا روگ لگ گیا ہے۔ میں تو جانوں شادی کی ضرورت ہے!" انھوں نے بڑی دلھن کی خفگی اور غصّے کے باوجود انتہائی رازداری سے بڑی دلھن کے کان کے پاس منھ لے جا کر کہا۔

"اور نہیں تو کیا!" بڑی دلھن کے چہرے پر بَری کے سارے جوڑوں کا گنگا جمنی مسالا لہریں مارنے لگا اور ایک دفعہ پھر بڑی دلھن، نشاط دلھن اور اماں بی نجی رنجشیں اور دشمنیاں بھول کر سرخ زری کے دوپٹے میں کرن بیل لگا لگا کر گیت گانے لگیں۔ بہنوں نے مہندی رچے ہاتھوں سے بھیا کے سر پر ڈالنے کے لیے اپنے زرتار آنچلوں کو سنوارنا شروع کر دیا۔ گھر میں خوشی بڑے دھیمے

دھیمے مگر بڑی ٹوٹ کر آرہی تھی۔ فدا حسین بیٹھک میں لیٹے لیٹے سب کچھ دیکھتے رہتے تھے۔ کیسے کیسے ہزار رنگ سارے گھر میں بکھرے ہوئے تھے۔ لچکے بادلے کی ساری چمک دمک نشاط دلھن کے گالوں کو دمکاتی رہتی تھی اور سرخ دوپٹے کے عکس نے بڑی دلھن کے چہرے کو شفق کی طرح کھلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ سب دیکھ دیکھ کر فدا حسین کے پورے جسم میں ریشمی کپڑے کی سی سرسراہٹ ہوتی رہتی تھی۔ وہ بوکھلا بوکھلا کر کبھی اندر آتے اور کبھی باہر جاتے۔ پھر نواز کو دیکھتے۔ ادھ موا دولھا انھیں عجیب روٹھا روٹھا اور بیزار بیزار سا لگتا تھا۔ وہ سوچتے:

"صاحب زادے بھی بونگ ہی ہیں۔ برف کا تودہ ہے میرا یار۔ کیا تھوتھنی سجائے بیٹھا رہتا ہے۔" اور تب وہ چلتے چلتے نشاط دلھن کی کمر میں ٹھوکا مارتے ہوئے پوچھتے:

"اجی تم نے لڑکی کو اچھی طرح دیکھ بھی لیا ہے؟ کوئی عیب تو نہیں ہے؟"

"یوں دیکھنے میں تو چاند کا ٹکڑا ہے، اب اندر سے اللہ جانے!" نشاط دلھن دانت سے سوئی کا دھاگا توڑتے ہوئے کہتیں۔

"ہاں پکا اطمینان کر لو۔ کبھی بعد میں پچھتاتی پھرو۔" یہ کہہ کر فدا حسین ان کے برابر ہی بیٹھنے لگتے کہ اماں بی بول پڑتیں:

"اے میاں، تم اِدھر کہاں بیٹھ رہے ہو؟ سارے کپڑے مسک جائیں گے۔ وہ ذرا سنار کی دکان تک ہو آؤ۔ اس نے آج زیور دینے کو کہا تھا۔" اور فدا حسین سوچتے:

"اماں بی کا پہرہ بڑا سخت ہے۔ گھر کے اندر انھوں نے ہر طرف دیواریں کھڑی کر دی ہیں۔ ہر راستہ بند ہے۔" فدا حسین مایوسی سے گردن لٹکا کر باہر آ گئے۔ اب وہ صرف کھانے ناشتے پر ہی اندر جاتے تھے۔ زیادہ وقت گھر سے باہر رہتے تھے۔

"کوئی خالی خولی کپڑے زیور سے ہی تھوڑی شادی ہو جاتی ہے۔ باہر کے سینکڑوں دھندے ہیں۔ ان میں لگا رہتا ہے۔ کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا ہے۔ اللہ رکھے پہلے بیٹے کی شادی ہے۔" فدا حسین کی گھر سے غیر حاضری کو اماں بی نے یہ کہہ کر نظر انداز کر دیا۔ پھر بھی کبھی کبھی پریشان ہو جاتی تھیں:

"ایسا بھی کیا کام!" رات کے اندھیرے میں انھوں نے آتش دان پر رکھی ہوئی گھڑی کو

ٹٹولااور پھر ان کے پیٹ میں ہَول سے اٹھنے لگے۔ مگر پھر ایک دم ان کو خیال آیا:
"آج تو اتوار ہے۔ قوالیوں میں گیا ہو گا۔" اور یہ سوچ کر وہ مطمئن ہو کر لیٹ گئیں۔ اتوار گزری اور پیر آئی اور پھر بہت سے منگل، بدھ اور جمعراتیں اماں بی نے جاگ جاگ کر گزاریں۔ فدا حسین کی خالی چارپائی کو ٹٹول ٹٹول کر جانے کس وقت ان کی آنکھوں میں نیند اتر آتی تھی اور پھر جب وہ فدا حسین سے صبح کو بازپرس کرتی تھیں تو وہ یہی کہتے تھے:
"بس اسی وقت آیا تھا جب آپ کی آنکھ لگی ہے۔ شامیانوں اور روشنی کے انتظام میں دیر ہو گئی تھی۔"

"وہ تو سب میاں ٹھیک ہے۔ مگر خبردار، ایسا کوئی غلط قدم مت اٹھانا کہ باپ دادا کا نام بھی ڈوبے اور دین مذہب سے بھی جاؤ۔ نعتوں اور قوالیوں تک تو ٹھیک ہے، مگر میاں بس اس کے آگے..."

"ارے اماں بی، اجی لاحول ولا... آپ کو معلوم ہی ہے میں شرع اور مذہب کا خود بہت احترام کرتا ہوں۔ نکاح کے بغیر کسی عورت کو نظر اٹھا کر دیکھنا بھی میرے نزدیک گناہ ہے۔"
"ہاں بس، یہی مجھے تم سے کہنا تھا،" اماں بی نے گہرا سانس لیتے ہوئے کہا۔
گھر کے اندر شادی کی تیاریاں زوروں پر تھیں۔ سردیوں کے چھوٹے چھوٹے دن لپاجھپ گزرے جا رہے تھے۔ کام ختم ہونے میں ہی نہیں آتا تھا۔ ہر شخص اپنی سدھ بدھ بھولا ہوا تھا۔ اور ادھر باہر فدا حسین ہزاروں دھندوں کو نبٹانے میں لگے ہوئے تھے۔ نہ معلوم کتنا الغاروں کام تھا جو سمٹائے نہیں سمٹ رہا تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر آنکھیں الگ سرخ ہو گئی تھیں۔ ہر وقت انگاروں کی طرح دہکا کرتی تھیں۔ پھر عجیب کسل مندی سی ان کے پورے وجود پر چھائی رہتی تھی۔ وہ بالکل بھولے بھولے سے ہو گئے تھے۔ غرق، خیالوں میں کھوئے ہوئے سے۔ اماں بی کہتی تھیں:
"اے میاں تم کیوں پریشان ہوتے ہو؟ سب کام ٹھیک ہو جائے گا۔ خدا بڑا حامی اور مددگار ہے۔"

ان ہی باتوں میں سارا وقت گزر گیا۔ گھر مہمانوں سے بھرنے لگا۔ ڈھولک کی تھاپ اور گیتوں کی آواز کسی وقت رکتی ہی نہیں تھی۔ عجیب ہڑبونگ سی مچی ہوئی تھی کہ ایسے میں ایک

دن دروازے پر ایک تانگا آ کر رکا۔ فدا حسین تانگے سے اترے اور پھر ہاتھ کا سہارا دے کر تانگے کے اندر بیٹھی عورت کو اتارا۔ سنہری ساری میں لپٹا ہوا دبلا پتلا جسم عجیب و غریب خوشبوئیں اُڑا رہا تھا۔ جھکی ہوئی پلکیں اور دہکتے گال اور بالکل دلھنوں والا انداز۔ بچوں نے دیکھا اور اندر بھاگ گئے۔

"امی، امی! اباجی بھیا کی دلھن لے آئے!" فوزیہ نے خوشی سے ہانپ ہانپ کر بڑی دلھن کو بتایا۔

"اے کہاں؟" بڑی دلھن پلنگ سے اٹھ کر دروازے کی طرف دوڑیں اور پھر فوزیہ کے سر پر دھپ جماتی ہوئی بولیں:

"تیرے منہ میں خاک۔ یہ بھیا کی دلھن ہے، موئی کوٹھے والی!" یہ کہہ کر انھوں نے چہرے پر بڑا سا گھونگھٹ کھینچ لیا۔

فدا حسین کی تیسری بیوی چوکھٹ پر کھلا منہ لیے بک دک کھڑی تھیں۔

آدم خور

لمبی خودرو گھاس سے سارا میدان بھرا ہوا تھا۔ جگہ جگہ کھدے ہوئے گڑھوں میں پھلوں کے پیڑ بے چارگی سے کھڑے ہوئے تھے۔ کنارے پر کچنار کا ایک تناور درخت تھا جس کے پتے آہستہ آہستہ خاکستری رنگ میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ امرود کے پیڑوں پر دن بھر محلّے کے بچے پتھر برساتے، اور دوپہر میں جب گھر کا ملازم بازار کے نکڑ کی دکان پر ریڈیو سننے چلا جاتا تو اس کی غیر حاضری سے پورا پورا فائدہ اٹھاتے۔ سامنے کی دیوار پر منی سکل کی بیل کو دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ یہ کبھی بہت تیز رفتاری سے بڑھی ہو گی؛ لیکن اب دفعتاً اس نے بڑھنا بند کر دیا تھا۔ اس کے پھول زرد ہو کر دن بھر زمین پر گرتے رہتے اور رات کو محلّے کے بچے اور بوڑھے اس سانپ کا انتظار کرتے جو اس بیل کی خوشبو سے مست کو جھومتا ہوا باہر آتا تھا۔ چھوٹے سے زمین کے ٹکڑے پر بے شمار درخت اپنے دیمک زدہ تنوں اور سوکھے خاکستری پتوں کے ساتھ اپنے نیم خمیدہ وجود کو سنبھالنے کی کوشش میں وقت سے پہلے بوڑھے دکھائی دیتے تھے۔ سامنے کی کیاری میں ہولی ہاک اور گلاب کے جھاڑ گڈمڈ ہو کر بڑھ رہے تھے۔ مئی کے تپتے ہوئے سورج اور گرم ہواؤں نے ان کی پتیوں کی روح تک کو جھلسا دیا تھا۔

انھی دنوں میری ملاقات محکمۂ باغبانی کے ماہر سردار بیگ سے ہوئی۔ اونچے قد اور جھُلسی ہوئی رنگت والے سردار بیگ نے اپنا فیلٹ اتار کر مجھے سلام کیا۔ سردار بیگ کے سر پر گنتی

کے چند بال تھے جن پر ہاتھ پھیرنے کے بعد اس نے کہا:

"ہر پودا لان کی خوب صورتی میں اضافہ کرتا ہے۔ ہر ایک کی اپنی اہمیت ہے۔ یہ سرو...

یہ جب اپنی بھرپور لمبان کو پہنچیں گے اس وقت یہ خود اپنی اہمیت منوالیں گے۔ کچنار کا درخت جس وقت کاسنی رنگ کے پھولوں سے لد جاتا ہے تب اس کے حسن کو دیکھنے والی آنکھ کی تلاش شروع ہوتی ہے۔ عام آنکھ اس حسن کو دیکھ نہیں سکتی۔ اور یہ آلوچے اور خوبانی کے پودے، سفید اور گلابی شگوفے، اور یہ امرود اور یہ ناشپاتی اور یہ وِیپنگ وِلو۔"

چھتری سے مشابہ درخت کی لمبی شاخیں زمین پر جھکی ہوئی تھیں۔ درخت کے آس پاس کی گھاس زرد ہو چکی تھی اور اب بے رنگ بھوسے میں تبدیل ہونی شروع ہو گئی تھی۔

"یہ درخت اپنے اِرد گرد کی ہر چیز کو کھا جاتا ہے۔" میں نے برابر کی دیوار پر ایک سر کو اُبھرتے ہوئے دیکھا۔

"تم سب درخت کٹوا رہی ہو؟" میری عمر رسیدہ پڑوسن نے میرا ارادہ بھانپ لیا تھا۔

"پھل پھلار کے درخت کاٹنا اچھا نہیں۔ ہاں، اس بڈھے بابا کو بھلے ہی کٹوا دو۔" انھوں نے گھنے اور زمین پر جھولتے ہوئے درخت کو خوف زدہ نظروں سے گھورا۔

میں نے درخت پر نظر ڈالی۔ اس پورے میدان میں تازگی اور بشاشت کا احساس مجھے پہلی مرتبہ ہوا۔ درخت کی لمبی شاخیں اور نوکیلے پتے ایک خاص لچک کے ساتھ جھول رہے تھے۔ ان شاخوں کے ساتھ ان گنت ننھی منی خواہشات وابستہ تھیں۔ اس کی ان ہی شاخوں کو پکڑ کر میری پڑوسن کی سرخ گالوں اور نیلی آنکھوں والی بچی نے بار بار اپنے ماما کو پکارا تھا:

"جھو جھو جھونٹے۔ ماما موٹے۔"

"تو پھر، تم سب درخت کٹوا رہی ہو؟" دیوار کے ساتھ ایک سرمئی سر پھر اُبھرا۔

مالی کے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کلہاڑی قدرے کانپی اور اس نے میری عقل پر افسوس کرتے ہوئے بے چارگی سے میری پڑوسن کو دیکھا۔

"عقل کی کوری بیگم صاحب!" مالی شاید دل ہی دل میں بڑبڑایا اور کچنار کے درخت پر کلہاڑی چلادی۔ کھوکھلا اور کِرم خوردہ تنا بغیر کسی آواز کے زمین پر گرا۔ مرجھائی ہوئی اور جھلسی ہوئی

کچنار کی منہ بند کلیاں زمین پر بکھر گئیں اور بوڑھی پڑوسن نے دیوار پر کھڑے کھڑے ایک طویل سانس لی۔

"نور خاں کے ہاں پے در پے کئی موتیں ہوئی تھیں!" انھوں نے مجھے آگاہ کیا۔

نور خاں فیکٹری میں کسی اچھے عہدے پر فائز تھے اور میرے آنے سے پہلے اس گھر میں رہتے تھے۔ فوری تبدیلی پر ملتان چلے گئے تھے۔

"میں تو یہی کہوں گی کہ سب کچھ اس منحوس درخت کی وجہ سے ہوا۔" میری پڑوسن نے سہم کر زمین پر جھولتے ہوئے درخت کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں خوف تھا اور ان کا بوڑھا سراپا ان کے گھنے اور گھرے اندھیرے میں لرز رہا تھا۔

مالی نے کٹے ہوئے درخت کو ایک طرف ڈالتے ہوئے ایک مرتبہ پھر میری طرف دیکھا، شاید میں اپنے ارادے سے باز آجاؤں۔

"پے در پے کئی موتیں!" بوڑھی پڑوسن نے دیوار پر سے ہٹتے ہوئے پھر سرد آہ بھری۔

باہر میدان میں ویپنگ ولو اپنے سبز کاہی رنگ کے ساتھ کھڑا تھا۔ لچک دار شاخیں زمین پر جھول رہی تھیں اور اس کے نوکیلے پتے میرے کان میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔ "جھوجھو جھونٹے۔"

"توبہ توبہ! اتنی پلی ہوئی بیل: کس قدر شوق سے نور خاں نے اس کو لگوایا تھا۔ نور خاں کی بیوی تو اس کی خوشبو کی دیوانی تھیں۔" شام کو آنے والی ایک نوجوان مہمان خاتون نے افسوس سے خالی دیوار کو دیکھا۔

"وہ... وہ بیل نے بڑھنا بند کر دیا تھا،" میں نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ دراصل مجھے پہلے دن سے اس بیل کو دیکھ کر سخت الجھن ہوئی تھی اور پھر اس کی خوشبو سے مست ہو کر جھومتا ہوا سانپ! ہنی سکل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے بعد مجھے خالی دیوار پر کئی دن تک سانپ کا پھن لہراتا ہوا نظر آتا رہا تھا۔ خوشبو... اور سانپ... اور سانپ کا انتقام... کتنے ہی قصے مجھے دنوں دہلاتے رہے تھے۔

"یہ درخت ابھی سلامت ہے۔" مہمان خاتون نے پشت پر جھولتے ہوئے درخت کو دیکھا۔

"نور خاں کے ہاں پے درپے کئی موتیں ہوئیں۔ آپ اس درخت کو کٹوا دیں،" مہمان

خاتون نے اپنی کرسی قدرے آگے کرتے ہوئے کہا۔

ان ہی دنوں میرے لان میں بہت تیزی سے کام شروع ہوا تھا۔ مالی کمر پر ہاتھ رکھ کر پہلے ایک تقریر کرتا۔ پھر اپنی تقریر کو بے اثر پا کر درختوں کے تنوں پر کلہاڑی چلاتا۔ کٹے ہوئے تنوں کو مصنوعی غصّے سے گھسیٹتا اور جاتے وقت ساری لکڑیاں سمیٹ کر اپنے گھر لے جاتا۔ لان کی سطح برابر کرنے کے لیے مٹی کا بھی انتظام ہو گیا تھا۔ ایک گدھے والا اپنے دو گدھے ہنکاتا ہوا لاتا اور دن بھر میدان کے گڑھوں کو ریتیلی مٹی سے پاٹتا رہتا۔ دیوار پر سرمئی سر اکثر و بیشتر اُبھرتا اور دو دھندلی اور سہمی ہوئی آنکھیں میدان کی ویرانی کو دیکھ کر خوف سے ابل پڑتیں۔

پڑوسن کے گھر میں سفیدے کے چند درختوں، کچھ ٹوٹے پھوٹے گملوں اور ایک دو گلاب کے پودوں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔ دیوار کے ساتھ دو تین چھوٹی چھوٹی کیاریاں بنا کر ان میں میتھی، پالک، دھنیا اور پودینہ لگا دیا گیا تھا۔ ان کیاریوں کو دن بھر پڑوسن کی اکلوتی اور لاڈلی پوتی اجاڑتی رہتی تھی۔ مختصر اور چھوٹا کنبہ تھا جو لان میں پڑی ہوئی بان کی ایک کھرّی چارپائی پر پورا آ جاتا تھا۔ ایک بیٹا، ایک بہو جو ان دنوں پورے دنوں سے تھی اور جو دن بھر اپنا آپ سنبھالے کاہلی سے پلنگ پر پڑی گاہے گاہے سیب اور مالٹے کھاتی رہتی تھی۔ بچی دن بھر کسی نہ کسی چیز کے لیے ریں ریں لگائے رکھتی تھی۔ کبھی دادی، کبھی پھوپی اور کبھی ماں کی گود میں چڑھی اپنے مطالبات کی فہرست میں اضافہ کرتی رہتی تھی۔

میری بوڑھی پڑوسن خود بیوہ تھیں۔ شوہر کی موت شادی کے دو سال بعد ہی ہو گئی تھی۔ ان کی موت طبعی موت تھی جو اچانک ہوئی تھی۔

"رات کو اس کا سایہ ساری زمین کو نگلتا ہوا سا لگتا ہے۔ ماں کی موت کی خبر پر نور خاں کی بیوی اس کو کٹوانے والی تھیں کہ نانی چل بسیں۔ وہاں سے ماتم پرسی کے بعد ابھی واپس ہی آئی تھیں کہ سسر کے مرنے کی خبر آ گئی۔ اللہ اللہ! سال کے اندر تین موتیں۔" میری پڑوسن نے میدان میں اس تنہا اور اکلوتے درخت کو دیکھ کر خوف سے آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے جانے کے بعد میں نے کھڑکی کا پردہ برابر کرتے ہوئے اپنے لان پر نظر ڈالی۔ زمین کی سطح برابر ہونے کے بعد اب گھاس نے نکلنا شروع کر دیا تھا۔ کناروں پر کیاریاں بن چکی تھیں اور ان میں گلاب کے پودے

لگائے جا رہے تھے۔ درخت سب ایک ایک کر کے کٹ چکے تھے، سوائے دیوار کے ساتھ لگے ہوئے ویپنگ ولو کے جو اپنی گھنی سر سبز شاخوں سمیت دن بھر زمین پر جھولتا رہتا۔

جب میدان میں بڑھتی گھاس کے ساتھ ساتھ سرخ بوٹی نے بھی بڑھنا شروع کر دیا تب دھوپ ڈھلنے کے بعد میں اپنے نوکیلے اوزاروں سمیت میدان میں نکل آتی اور بڑے انہماک سے اس بوٹی کو نکالتی رہتی۔ کبھی نظر اٹھا کر دیوار کی طرف دیکھتی تو سر مئی سر کو دیوار پر پڑا ہوا پاتی۔

"لان تو تمہارا بڑا خوبصورت ہو گیا مگر..." اتنا کہنے کے بعد بوڑھی پڑوسن کے ہونٹ خود بخود بند ہو جاتے۔ ابھی میں بوٹی اکھاڑنے میں مصروف ہوتی کہ شام کے ملاقاتی آنے شروع ہو جاتے — نوجوان جوڑے جو ایک مدّت سے کالونی میں رہ رہے تھے اور جو درختوں اور پودوں کی نفسیات سے بخوبی واقف تھے۔

"یہ باڑھ بارہ مہینے ہری رہتی ہے۔ مگر گارڈینیا اس سے بھی اچھی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس کا پورا پردہ بن جاتا ہے۔ دیوار کے ساتھ ساتھ ایک دوسری ہری بھری دیوار۔ آپ اگر گارڈینیا لگائیں تو میں انتظام کروا سکتا ہوں۔ یوں تو لوگوں نے مور پنکھ کی بیج بھی اپنے گھروں میں لگائی ہے۔ آپ ذرا گھر سے باہر نکل کر دیکھیے۔ صاحب یہاں بڑا مقابلہ ہے۔ لوگوں کا یہ شوق دیوانگی کی حد تک بڑھ چکا ہے۔ مونسٹریا اور ربر پلانٹ... ایک ایک پودا سو سو روپے میں خریدا ہے بھائیوں نے۔"

"لیکن جو شوق عروج پہ ہے وہ پتھریلی مصنوعی پہاڑیوں پر خاردار پودوں کی کاشت کا۔ ٹیڑھے میڑھے نوکیلے خاردار پودے ہر گھر کی خوبصورتی میں اضافہ کرتے ہوئے آپ دیکھیں گی۔"

"آپ کا لان درست ہوتے ہوتے تقریباً سال لگے گا۔ سی ڈی اے کی نرسری سے رابطہ قائم کیجیے۔ مگر یہ کیا!" بہت سی آنکھوں نے ایک ساتھ خالی لان کا جائزہ لیا۔ اندھیرا بڑھ جانے پر زمین پر درخت کا سایہ پھیل رہا تھا۔ سرخ گالوں والی بچی درخت کی شاخیں پکڑے جھول رہی تھی اور گا رہی تھی۔ پڑوسن کی بچی نے پودینے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا تھا اور اب مرچوں کے پودے اکھاڑنے کے لیے ضد کر رہی تھی۔ اس کی دادی اس کو سمجھا رہی تھیں۔

"نہ لال! بوٹوں کو نہیں اکھاڑتے۔ توبہ توبہ!"

مجھے پہلی مرتبہ جھرجھری سی آئی۔ خوف کی ایک لہر سی میرے پورے جسم میں دوڑتی چلی

گئی۔ ہنڈیا میں کفگیر چلاتے ہوئے اتفاق سے میری نظر کھلی ہوئی کھڑکی پر پڑی۔ سامنے درخت اپنی خمیدہ شاخوں سمیت جھول رہا تھا۔ زمین پر اس کا طویل سایہ پھیلا ہوا تھا۔ محلّے کے بچے جو کبھی ڈھیروں پتھر لے کر اور مختلف آوازیں پیدا کرتے ہوئے میرے گھر کی طرف سے گزرتے تھے، اب خاموشی سے گردن جھکا کر نکل جاتے۔ ہرے بھرے میدان میں دن بھر دھول سی اُڑتی رہتی۔ شام کو مالی آتا اور پائپ سے گھاس میں پانی دے کر چلا جاتا۔ زندگی کسی دھماکے اور بغیر کسی آواز کے یکسانیت سے گزر رہی تھی۔ بوڑھی پڑوسن کا سرمئی سر اب بھی اکثر و بیشتر دیوار پر ٹکا میدان اور درخت کا جائزہ لیتا رہتا۔ لیکن ان آنکھوں میں اب نہ وحشت تھی اور نہ خوف۔ نور خاں کے گھر کی تمام موتوں کو وقت اور رضائے الٰہی کہہ کر وہ اب ایک خاموش تماشائی کی طرح دیوار پر ٹھوڑی ٹکائے اس لان کو تکا کرتیں جہاں کبھی بے شمار درخت تھے اور جن پر لد پھند کر پھل آتے تھے اور اب جہاں صرف نیچے نیچے زمین کے ساتھ چمٹ کر بڑھنے والی گھاس کا سبز کاہی فرش تھا اور ایک بے طرح بڑھتا ہوا جھاڑ جھنکاڑ۔

میں ٹیلی فون کی گھنٹی پر دوڑی۔ بے طرح ٹوٹی پھوٹی آواز۔ "چاچا کا انتقال ہو گیا۔" سینکڑوں میل دور سے آنے والی آواز میں بے طرح انتشار تھا۔ ٹیلی فون کا ریسیور رکھنے کے بعد مجھے اپنے اندر اور باہر شدّت سے کھوکھلے پن کا احساس ہوا۔ چاچا دل کے مریض تھے۔ میں نے جب سے ہوش سنبھالا انھیں نپے تلے اصولوں پر زندگی گزارتے ہوئے پایا۔ اتنا کھائیں گے، اتنا چلیں گے، اتنا لکھیں گے اور اتنا بولیں گے اور اس قدر آرام کریں گے۔ زندگی میں ترتیب اور سلیقے کی موت کے وہ قائل تھے۔ سلیقے کی موت سے ان کی کیا مراد تھی میں آج تک نہیں سمجھ سکی۔ اب سوچتی ہوں تو رہ رہ کر وہ بات یاد آتی ہے۔

"یہ چھپکلیاں جن ہوتی ہیں!" بیگم اطاعت نے مجھے بتایا تھا۔

ان کے ہاں ایک صاحبہ کو بس یہ دُھن تھی کہ چھپکلیاں مرواتی رہتی تھیں۔ آخر ایک چھپکلی نے انتقام لیا۔ بیگم صاحبہ سوکھ کر ڈھانچا ہو گئیں اور پھر آہستہ آہستہ ان کی رنگت عین مین چھپکلی جیسی ہو گئی۔ پھر شکل بھی تبدیل ہونی شروع ہوئی۔ چھ مہینے کے اندر اندر وہ ایک دراز قد چھپکلی بن چکی تھیں۔ میں بڑی عقیدت سے یہ قصہ سن رہی ہوتی تھی کہ دیکھتی...

نچلے ہونٹ کے درمیان چمک دار تل لرزتا ہے اور مسکراتا ہے اور پھر آواز آتی ہے:
"چڑیل... ایمان کی کمزوری!" ہونٹ سکڑتا ہے اور سیاہ چمک دار تل بدستور مسکراتا رہتا ہے۔ ہماری کم علمی اور وہموں کا چاچا کے پاس ایک ہی جواب تھا۔
ایک دائمی مسکراہٹ اور ایک بٹیلا لفظ: چڑیل!

میں نے کھڑکی کا پردہ ہٹایا۔ باہر میدان میں دھوپ ترچھی ہو کر پڑ رہی تھی۔ نومبر کا وسط تھا اور میدان کی سبزی پر ہلکا سنہری رنگ پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ دفعتاً میری نگاہ میدان میں کھڑے ہوئے درخت پر پڑی اور پھر بہت سی آوازوں نے مجھے سر سے پیر تک جھنجھوڑ ڈالا۔

"دیکھو جی، ہم نے تم سے کتنا کہا تھا کہ اس درخت کو بھی کٹوا ڈالو۔ پر تم نے نہیں سنا۔ اب دیکھ لیا نا۔ یہ یوں لیتا ہے انتقام۔ کیسی سونے سی جان کو نگل لیا۔" بوڑھی پڑوسن ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئیں اور دیر تک اکھڑی اکھڑی سسکیاں لیتی رہیں۔ اس لمحے میں نے اپنی پشت پر ایک بھاری ہاتھ کی تھپکی کو محسوس کیا اور میرے کان میں ہزاروں مرتبہ کا سنا ہوا جملہ سرگوشی کرتا ہوا گزرا۔ میں نے اپنے اندر ایک بھاری پن محسوس کرتے ہوئے کلام پاک اٹھایا اور تلاوت شروع کر دی۔ باہر گہرا سنہرا دن درخت کی شاخوں پر آہستہ آہستہ اتر رہا تھا اور پورے میدان میں سونا بکھرا ہوا تھا۔ زرد پتوں کے ڈھیر اور زرد گھاس کا فرش۔

اور پھر دوسرے ہی ماہ ماموں کے انتقال کی خبر ملنے پر میں نے اپنے گھر کی ایک ایک چیز کو ٹٹولا۔ سیاہ، چوکور اور لمبی میزیں۔ سیاہ فریم والا ایک لمبا تانت کا صوفہ جس پر بیٹھنے والا بڑا تنگ ہو کر بیٹھتا تھا اور ہمیشہ بے چینی سے پہلو بدلتا رہتا تھا؛ جس کے کھوکھلے فریم پر بچے دھڑا دھڑ جوتے مارتے تھے اور بے ہنگم آواز پیدا ہونے پر اکثر اپنے ماں باپ سے مار کھاتے تھے۔ یہ فرنیچر ماموں کی اپنی طبیعت کی اُپج تھی۔ جب تک وہ یہاں رہے انھوں نے اس سامان کو بڑی نفاست سے استعمال کیا۔ جاتے وقت وہ یہ سامان مجھے دے گئے تھے۔ اور اب ماموں خود نہیں تھے۔ ان کا سامان، ان کی لمبی اور چوکور میزیں، ان کا لمبا تانت والا صوفہ، ان کے خاردار پودوں کے گملے، ان کے گلاب اور ان کی بوگن ولا...

ممانی نے خط میں لکھا تھا:

"انھیں قبرستان میں بڑی اچھی جگہ ملی ہے۔ زندگی بھر پھولوں اور پودوں میں مگن رہنے والا ڈاکٹر مرنے کے بعد پھولوں کے ڈھیر تلے دفن کر دیا گیا۔"

گلابوں کی خوشبودار چھاؤں اور گھنی خوشبو۔ ماموں، تمھارے ہزاروں چاہنے والے ہیں جو پھوٹتے ہوئے ہر شگوفے کے ساتھ تمھاری آواز سنتے ہیں اور جب سال کے سال کلب کے وسیع میدان میں آرائشِ گل کی تقریب منائی جاتی ہے گلدانوں میں سجی ہوئی ہر کلی تمھیں ڈھونڈتی ہے۔ گلاب کی پنکھڑیوں پر بکھرے ہوئے نئے اور انوکھے رنگوں میں تمھاری مسکراہٹ چھلکتی ہے۔ تپتی دوپہر میں فیلٹ لگائے اور ہاتھ میں سرنج پکڑے ہوئے خاردار پودوں پر جھکا ہوا تمھارا وجود...

"پتر جی! تم بھی اپنی ضد کے بڑے ہی پکے ہو۔ اب بھی سن لو اور کٹوا ڈالو اس درخت کو!"

میری پڑوسن پھر ہانپتی کانپتی کمرے میں داخل ہوئیں اور میرے برابر ہی بیٹھ کر اپنی دھندلی آنکھیں دوپٹے کے کونے سے صاف کرنے لگیں۔ ان کی آنکھوں میں خوف تھا اور ان کا بوڑھا سراپا کمرے کے دھندلے ماحول میں بڑا کمزور نظر آ رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میرا ہاتھ پھر کھڑکی کے پردے کی طرف بڑھا۔ پردہ ہٹانے کے بعد میں نے دیکھا۔ دسمبر کی ٹھٹھری ہوئی صبح۔ سورج میں نہ حدّت تھی اور نہ چمک۔ اس کی کرنیں زرد زمین پر ترچھی پڑ رہی تھیں۔ باہر درختوں کے سب پتے جھڑ چکے تھے۔ زمین پر ان کے لمبوترے اور بے ہنگم سائے پھیل اور سکڑ رہے تھے۔ فضا میں آوازوں کا شور تھا اور زمین کسی دھماکے کی منتظر تھی۔ خطرے کا سائرن ابھی ابھی بج کر تھما تھا۔ لوگوں نے اپنے گھروں کی کھڑکیوں پر سیاہ کاغذ لگا لیے تھے اور گھروں میں کسی محفوظ کونے کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جانے لگی تھی۔ گھروں کے اندر وحشت تھی اور گھروں کے باہر سہمے قدموں کی سرسراہٹ۔ دور میدان میں لوہے کے کھمبوں میں اٹکا ہوا بچوں کا جھولا ساکت تھا۔ کھمبوں کا تیز نارنجی رنگ دن کی مٹیالی روشنی میں بھی چمک رہا تھا۔ بیگم صمد کی چمکیلی آنکھوں والی لڑکیاں اپنی کھڑکی میں بیٹھی جھولے کی ان ڈوریوں کو تک رہی تھیں جن پر بقول ان کی ماں کے اب چڑیلیں جھولتی ہیں؛ قدم باہر نکالا اور چمٹیں۔ رانی نے ماں کا ڈراوا سن کر کہا تھا:

"چڑیل کیا، اگر چڑیل کا ابا بھی آ جائے تو میں جھولوں گی۔" اس کی اس دیدہ دلیری کو دیکھ

کر بیگم صمد نے جھولے کی ڈوریاں سب سے اوپر والے کھمبے کے ساتھ بندھوا دی تھیں۔ رانی کھڑکی میں بیٹھ کر خطرے کے سائرن کا انتظار کرتی اور جب خطرہ دور ہونے کا سائرن بجتا تو وہ کھڑکی سے کود کر جھولے کی طرف دوڑتی اور پھر آدھے فاصلے ہی سے واپس آجاتی۔ جھولے کے ساتھ چمٹی ہوئی ہزاروں چڑیلیں! خطرے کا سائرن اور بموں کے دھماکے! میدان میں میخوں کے ساتھ جڑا ہوا لوہے کا کھمبا بہت اونچا ہو چکا تھا اور اس کے ساتھ بندھا ہوا جھولا بچوں کی پہنچ سے بہت دور تھا۔ رانی کی نظریں جھولے کی اونچائی ناپ ناپ کر تھک چکی تھیں۔

''وہ سارے لمبے ہاتھوں اور اونچے قد والے آدمی کہاں گئے؟'' وہ خود سے پوچھتی اور واپس آ جاتی۔

وہ شام پچھلی تمام شاموں سے مختلف تھی۔ سورج غروب ہو چکا تھا اور ڈوبتے سورج کی سرخی پورے آسمان پر پھیلی ہوئی تھی۔ زمین سے آسمان تک ایک ہی رنگ بکھرا ہوا تھا ـــ گہرا عنابی رنگ۔ عمارتوں پر دھندلے بلب روشن تھے اور سہما ہوا سناٹا دبے قدموں گھروں میں داخل ہوا تھا۔ ہوا میں سوکھے پتوں کی سرسراہٹ اور ہلکی ہلکی سرگوشیاں تھیں۔ میں اپنے لان میں کھڑی تھی۔ مجھے انتظار تھا ان تمام بیواؤں اور یتیموں کا جن کے شوہر اور باپ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے تھے۔ ہتھیار تھامنے والے ہاتھوں نے ہتھیار ڈال دیے تھے۔

میدان میں بوڑھا خرانٹ درخت جوں کا توں موجود تھا۔ میں نے چور نگاہوں سے دیوار کو ٹٹولا۔ دیوار خاموش تھی۔

''میں اس درخت کو کٹوا رہی ہوں!'' میں نے چیخ کر اس ہجوم کو آگاہ کرنا چاہا جو دندناتا ہوا میری طرف بڑھ رہا تھا، پر آواز میرے حلق میں ہی اٹک کر رہ گئی اور میں بے خیالی میں چلتی ہوئی درخت کے قریب آ گئی۔

درخت کی شاخیں شادابی سے زمین پر جھول رہی تھیں۔ ان شاخوں پر ننھے منے ہاتھوں کی گرفت ابھی تک باقی تھی۔

میرے پڑوس میں رہنے والی سرخ گالوں والی بچی نے بارہا ان ہی شاخوں کو پکڑ کر اپنے ماما کے آنے کی دعائیں مانگی تھیں:

"ماما آئے دوروں سے۔ گھوڑے باندھو کھجوروں سے۔"

اور ماما دور خاردار تاروں کے پیچھے بچی کی پکار سے بے خبر کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا کہ:

اک دھوپ تھی جو ساتھ گئی آفتاب کے

میں نے آگے بڑھ کر درخت کی پھیلی ہوئی شاخوں کو اپنی مٹھیوں میں بھر لیا اور تب میرا دل چاہا اس درخت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکوں اور اس کی ساری پتیوں کو ہوا کے سپرد کر دوں۔ بوڑھا خرّانٹ، انسانوں کو نگل جانے والا یہ آدم خور... پر دوسرے ہی لمحے میں نے بہت سی چھوٹی چھوٹی آوازوں کو اپنے قریب محسوس کیا۔ آج ہزاروں ننھی منی آوازوں نے مل کر میرے لان میں کہرام سا مچا رکھا تھا۔

بہت سی آوازیں اور بہت سے ہاتھ۔ درخت کی پھیلی ہوئی ان گنت شاخوں پر جھولتے ہوئے ان گنت ننھے منے جسم! اور تب درخت کی لمبوتری اور لچک دار شاخیں خود بخود میری گرفت سے آزاد ہو کر زمین و آسمان پر بکھر گئیں اور میں گردن جھکائے اندر چلی آئی۔

کمرے میں اندھیرے کی لکیریں لمحہ بہ لمحہ گہری ہوتی جا رہی تھیں۔ کھڑکی کا پردہ ہٹا ہوا تھا۔ باہر ہرا بھرا میدان، ویپنگ ولو، درخت کی پھنگل پر بنا ہوا چڑیا کا گھونسلا، دیوار پر ٹکا ہوا سرمئی سر، میدان میں پھیلے ہوئے پودوں کے بے ہنگم سائے اور آوازیں... وسیع اور گھنے سناٹے میں دم بہ دم بڑھتا ہوا ایک معصوم شور... جیسے سرمئی، سرخ، زرد، کالے، نیلے اور ہریالے بول یک زبان ہو کر کہتے ہوں: "گھنے درخت اور ان سے چھنتی ہوئی دھوپ ہی تو آخر سورج کی ساکت دلیل ہیں۔"

ہم سفر

اس نے بس سے باہر جھانک کر دیکھا۔

ہزاروں نام اپنے کھوکھلے اور گھناؤنے وجود سے الگ ہو کر سڑک پر برائے برائے پھر رہے تھے۔ عبدالغفور، عبدالشکور، محمد حاتم، اکرام الٰہی، بخت خاں، طاہر علی، مریم، طاہرہ، زینت اور شوکت۔ ایک ہجوم ـــــ بپھرے ہوئے غم زدہ ناموں کا ایک جم غفیر ـــــ اس نے دیکھا کہ کوئی بھی نام کسی انسان کے ساتھ چپکنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ نام انسان سے مکمل بغاوت کر چکا تھا۔

اس نے بس کے اندر نظر ڈالی۔

بے شمار لمبی اور پُراسرار ناکوں والے انسان۔ اس نے دیکھا کہ مکھیاں بس میں بیٹھے ہوئے تقریباً ہر مسافر کی ناک پر بیٹھ چکی تھیں۔ مسافروں کی ناکیں پُراسرار طریقے سے تبدیل ہو رہی تھیں۔ ناکوں کے اس بتدریج پھیلنے سکڑنے اور پھولنے کے عمل کو سکندر علی خان نے خود بھی محسوس کیا۔ اس کی ناک بھی سفر کے آغاز میں لمبی اور طرح دار تھی۔ مگر اب بس میں اُڑتی ہوئی مکھیوں کی غذا۔ صرف بس میں گھومنے والے اخبار فروش کی ناک چھوٹی اور مختصر تھی جس کے نتھنے اس وقت بری طرح پھڑک رہے تھے۔

باہر ناموں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا۔ اخبار فروش نے آواز لگائی:

"مسلمان دس پیسے میں۔"

"کیا کفر بکتا ہے،" ایک گرج دار آواز بس میں گونجی اور اس کے ساتھ بہت سی چھوٹی بڑی ناکیں اپنی ہیئت بدلنے لگیں۔ باریش ناک چہرے پر سے کھسکنے لگی اور پھر تھوڑی دیر بعد اپنے حجم سے دوگنی ہو کر چہرے کے بیشتر حصّے کو گھیرنے لگی۔ اخبار فروش لڑکے کی بظاہر بے ضرر سی ناک خطرناک حد تک اپنی اہمیت جتانے کی کوشش میں چہرے پر پھڑپھڑائی۔

"زبان کے آگے خندق کھدی ہے۔ جو منہ میں آتا ہے بکتے چلے جاتے ہیں۔ استغفراللہ! مسلمان دس پیسے میں! لاحول ولا!" بزرگ نے اپنی پھیلی ہوئی ناک کو قدرے اور پھیلایا اور باری باری بس میں بیٹھے ہوئے ہر مسافر کو گھورا۔ ان کے برابر بیٹھے ہوئے نوجوان نے ناک کے پھنگل پر سرکتے ہوئے چشمے کو درست کیا اور پہلو بدل کر کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

"لونڈا امپورٹڈ ہے۔ ہر چیز بلائتی،" دوسری سیٹ پر بیٹھے ہوئے ادھیڑ عمر اور چپٹی ناک والے آدمی نے گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

"صاحبزادے، ذرا الگ ہو کر بیٹھو،" بزرگ نے اپنا داہنا نتھنا سکیڑا اور بولے:

"یہ ٹائی یہ سوٹ اور یہ چشمہ، یہ قلمیں اور یہ مونچھیں! نہ زورِ بازو اور نہ قوتِ پرواز۔"

"مسلمان دس پیسے میں،" اخبار فروش کی آواز نتھنوں کو پرے دھکیل کر ابھری۔

"میں اپنی ذات پر کوئی تنقید برداشت نہیں کر سکتا،" نوجوان کی ولائتی ناک کی جگہ دیسی ناک نے لے لی۔ وہ اپنی گردن کو پھلا کو قدرے ٹیڑھا کرتے ہوئے بولا:

"آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں آج کا نوجوان ہوں اور میں بالکل..."

"بے نتھا بجار ہوں،" ایک صحافی نے جلدی سے اس کا جملہ پورا کیا۔

چھت پر چپکی ہوئی مکھی نے اپنے پروں کو حرکت دی اور پھر اپنے پیر پروں سے باہر نکال کر ہر مسافر کو باری باری دیکھا۔ کھڑکی کے ساتھ کمر ٹکائے ہوئے نوجوان نے اپنے ساتھی کو کہنی مار دی۔ ساتھی نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں اور ہنکارا بھرا:

"میں یہ کہہ رہا ہوں کہ تم میرے گھر چلو۔ تمھیں مکمل تفصیلات سے آگاہ کروں گا۔ جو کچھ ہوا ہے اور جو کچھ آئندہ ہو گا۔ آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے اس کے متعلق میرا علم بڑا وسیع ہے۔ تم اطمینان رکھو میں تمھیں اب مزید بور نہیں کروں گا۔ بور کرنے کے لیے اب میرے پاس کوئی

موضوع نہیں۔ گھر چل کر ہم صرف کھانا کھائیں گے۔ کھانا بھی کوئی بے حد اہتمام سے نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت کے کھانے میں ہمیں صرف ایک ایک سنکھیا کی پڑیا ہی ملے۔ دراصل میری بیوی بڑی ٹیڑھی کھیر ہے۔ گھر چل کر تم اس سے ضرور ملنا۔ بس یوں ہی سی عورت ہے۔ بے حد احدی اور بے حد پھوہڑ۔ وہ اس وقت بھی پھسکڑا مارے زمین پر بیٹھی ہو گی اور اپنے اوباش لڑکے کے پیسے دو پیسے پر اُلجھ رہی ہو گی۔ میرے لڑکے کو دیکھ کر تمہیں ذرا بھی تعجب نہیں ہو گا۔ موجودہ عام نوجوانوں کی طرح کسی بھڑکیلے لباس میں لمبی قلموں میں اور دراز زلفوں کے ساتھ وہ تمہیں بائے کہتا ہوا گزر جائے گا۔ اس کے گزرنے کے ساتھ تمہاری ناک میں بدبو کا ایک بھبکا آئے گا۔ یہ میلی جرابوں، چمڑے کی لیرے لٹکی ہوئی جیکٹ اور بغلوں کے بڑھے ہوئے بالوں کی ملی جلی بدبو ہو گی۔ سونگھتے ہوئے جب تم گھر کے بائیں طرف والے کمرے کی طرف سے گزرو گے تو میری لڑکی کو دیکھ سکتے ہو جو اپنے بالوں کے لہریے ختم کرنے کے لیے بالوں میں رولز لگائے کسی مغربی موسیقی کی دُھن پر آہستہ آہستہ ہل رہی ہو گی۔ ہماری گھریلو فضا بڑی پُر سکون ہے۔ ہم سب ایک دوسرے سے بالکل بے تعلق ہیں۔ دراصل یہ بے تعلقی ہی وہ تعلق ہے جس پر ہمارے گھرانے کی اساس ہے۔" نوجوان سانس لینے کے لیے رکا اور پھر اپنے ساتھی کو دیکھا جو اکتایا ہوا اور قدرے جھنجلایا ہوا بیٹھا تھا۔ اس کی ناک جو چہرے کے بیشتر حصے کو گھیرے ہوئے تھی انتہائی کمزور نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے ساتھی کی باتوں کو سنے بغیر اپنے ناک کو غیر ارادی طور پر بکوٹتا رہا تھا جیسے وہ ساری باتیں ناک کے راستے سے گزر کر زبردستی ذہن میں داخل ہو رہی ہوں۔ اس نے اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لڑکے نما مرد کو دیکھا جو ہاتھ میں ایک کاغذ کا پرزہ پکڑے ہوئے تھا۔

"یہ کاغذ کا پرزہ میرے ہاتھ میں ہے۔ اس پر صرف پچیس لفظ لکھے جا سکتے ہیں۔ لیکن میں اپنے بھائی کا نام بھول گیا ہوں جو خاردار تاروں کے پیچھے رہتا ہے۔"

"تمہیں اپنا نام یاد ہے؟" اس شخص نے حیرت سے سکندر کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلایا اور باہر ناموں کے ہجوم میں اپنا نام تلاش کرنے لگا۔

سکندر علی خان نے دیکھا کہ ان ناموں میں ایک نام کریم بخش تھا۔ جس کا وجود لوہے کی سلاخوں کے پیچھے اپنے بے دم ہاتھوں سے زمین پر مختلف حروفِ تہجی لکھ رہا تھا۔

لوہے کی سلاخوں کے پیچھے سے اُبھرنے والی آواز اب بتدریج بڑھتی جا رہی ہے۔ حافظ اور سعدی کے اشعار، عمر خیام کی رباعیات، اقبال، میر اور غالب... سلاخوں کے پیچھے آواز کا شور اب قدرے اور بڑھ چلا ہے۔

[محافظ نے کریم بخش کو کٹہرے سے باہر نکالتے ہوئے پوچھا:

"تمہارا جرم؟" ملزم نے اپنا داہنا ہاتھ کرتے کی جیب میں ڈالا اور سرکنڈے کا قلم نکال کر زمین پر نون کا دائرہ بنا دیا۔ محافظ نے اس دائرے کو جوتے کی نوک سے مٹاتے ہوئے پھر پوچھا:

"اپنا جرم بتاؤ؟" مجرم نے پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے ہوئے قلم کی جنبش دی اور زمین پر "ج" کے سر "م" کی لمبان اور نون کے دائرے بنتے چلے گئے۔

"یہ سب کچھ کیا ہے؟" محافظ جھلایا اور اس نے زمین پر بکھرے ہوئے نقوش کو بغور دیکھا اور پھر ملزم کے ہاتھ کی طرف بڑھا جس میں اس نے سرکنڈے کا قلم پکڑا ہوا تھا۔ قلم پر جھپٹا مارنے سے پہلے اس کی نظر سیدھے ہاتھ کی درمیانی انگلی پر پڑی اور اس کو جھرجھری سی آ گئی...

تحصیل چھانگل کا رقبہ چند گھروں پر مشتمل تھا۔ کچی سڑکیں اور کچے مکان۔ مسجد کے باہر کنواں تھا اور کنویں کے ساتھ چبوترہ۔ تحصیل چھانگل کے بچے دن بھر کنویں پر تختیاں دھوتے، سکھاتے اور لکھتے۔ پھر دھوتے، پھر سکھاتے اور پھر لکھتے۔ بچوں کو لکھنے کی ایک دُھن تھی، ایک سودا تھا، اچھا خط اور اچھے حروف بنانے کی لگن۔ اور جب دائرے اور حروف پختہ ہو جاتے تو تختیوں کو ملتانی مٹی سے کچھ اور چمکایا جاتا۔ دواتوں میں سیاہی کی نئی پڑیاں ڈال کر نیا کپڑا ڈالا جاتا۔ مولوی کریم بخش سرکنڈے کے پکے قلم پر چاقو کی نوک سے قط رکھتا اور بچے مختلف اشعار اور عبارتوں سے اپنی تختیوں کو بھرنے لگتے۔ مسجد کے چبوترے پر بیٹھ کر مولوی کریم بخش سرکنڈے کے قلم کی نوک سے ایک جہان بچوں کے ذہنوں میں انڈیلتا رہا تھا۔

پہرے دار نے ملزم کی کٹی ہوئی انگلی کو ایک بار پھر غور سے دیکھا اور اس کا ذہن قلابازیاں سی کھانے لگا۔ کنویں کی مینڈھ کے ساتھ رکھی ہوئی لپی پتی تختیاں، چبوترے پر سر سے سر جوڑے ہوئے بچے اور مولوی کریم بخش۔ سرکنڈے کا قلم، چمک دار چاقو اور سیدھے ہاتھ کے درمیان سے کٹی ہوئی درمیانی انگلی!

محافظ نے ایک مرتبہ پھر ملزم کو بغور دیکھا۔ وہ اب بھی قلم کی نوک سے زمین پر حروف کے دائرے اور سر بنا رہا تھا۔ اس نے قلم کو اس انداز سے پکڑا ہوا تھا جیسے کسی نو آموز کو لکھنا سکھا رہا ہو۔ آہستہ آہستہ وہ زمین پر ایک ہی حرف بار بار بنا رہا تھا اور ان سلاخوں کے پیچھے سے دیکھ بھی رہا تھا۔

تحصیل چھانگل کی مسجد کا پختہ چبوترہ جس پر بچے مختلف گروہوں میں بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنی تختیوں پر خوش خط تحریریں لکھ لکھ کر مٹا رہے ہیں۔ ملتانی مٹی سے دھلی ہوئی تختیاں کنوئیں کی مینڈھ کے ساتھ لگی ہوئی ہیں۔ دواتوں میں سرکنڈے کے قلم پڑے ہوئے ہیں۔ دھلی دھلائی سوندھی مٹی کی خوشبو میں بسی ہوئی تختیوں پر عمارتیں اُبھر رہی ہیں۔ نپے تلے دائرے، جمے ہوئے خط، پختہ اور پکی تحریریں۔]

اور باہر شہروں اور قصبوں کی دیواریں بدخط عبارتوں اور تحریروں سے بھری ہوئی ہیں۔ دیواروں اور عبارتوں پر ٹیڑھے میڑھے حروف کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگ رہے ہیں ـــــ سیاہ اور کوڑیالے حروف ـــــ اور تحصیل چھانگل کے بچے اب بڑے ہو چکے ہیں اور وہ بھی اپنے نام و نشان سے جدا ہو چکے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں سرکنڈے کے قلم کی بجائے اب پلے کارڈ ہیں۔ آج کی تعلیم نے ایک پوری نسل کو موت کی نیند سلا دیا ہے۔ کیا خوب کہا ہے لسان العصر نے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا

افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

بس کی چھت کے ساتھ چپکی ہوئی مکھی بدستور مسافروں کو گھور رہی ہے۔

ایک مسکین سے آدمی نے باریش بزرگ کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرتے ہوئے پوچھا:

"ہاں تو حضور کیا آئے گا؟"

"موت!" پاس کھڑا ہوا کسرتی بازو اور بھنچے ہوئے سینے والا مزدور جھلایا اور کندھے پر رکھے ہوئے کدال کو بس کے فرش پر مارنے لگا۔

باریش بزرگ نے کرتے کی آستین سے اپنی آنکھوں کو خشک کیا اور بولے:

"میں صرف اتنا پوچھتا ہوں کہ غیرتِ اسلام کہاں ہے؟"

"لیڈیز میں ہو گی،" مزدور نے کدال کندھے پر رکھتے ہوئے عورتوں والے حصے پر نظر ڈالی۔

پچھلے اسٹاپ پر جو چیز بس میں چڑھی تھی وہ لاوے سے ملتی جلتی تھی۔ جسم اور لباس کے درمیان دھینگا مشتی ہوتی دیکھ کر ہی ڈرائیور نے بس روکی تھی۔ مسافر کھڑکی سے باہر گردنیں لٹکانے کے بعد اب ڈرائیور کی انسان دوستی پر تبصرہ کر رہے تھے۔

بس میں بیٹھے ہوئے افراد کی ناکیں مستقل اپنی ہیئت بدل رہی تھیں۔ اخبار فروش لڑکا مسلمان کی قیمت بتا رہا تھا۔ کنڈکٹر دھڑادھڑ بوگس ٹکٹ کاٹ کاٹ کر کھڑکی کے باہر ان کی فاختہ اُڑا رہا تھا اور چوری کی ریزگاری کو ڈرائیور کی نظر بچا کر نیفے میں ٹھونس رہا تھا۔ چست لباس والی عورت کی کمر کے ساتھ جڑا ہوا زپ آہستہ آہستہ کھلتا جا رہا تھا۔ بزرگ اور دیگر مسافر لڑکی کی کمر پر نظریں گاڑے ان تلوں کو دیکھ رہے تھے جو گردن اور ریڑھ کی ہڈی پر نصف دائرے کی شکل میں پھیلے ہوئے تھے اور قربِ قیامت کا پتا دے رہے تھے۔

مکھی نے چھت کے ساتھ چپکے ہوئے اپنے پروں کو سکیڑا اور اخبار فروش کے کان کے پاس جا کر بھنبھنائی۔ بس میں ایک ساتھ کئی آوازیں ابھریں۔ اخبار فروش نے ہاتھ میں پکڑا ہوا بنڈل کان کے پاس مارا۔ مکھی اس کے کان سے اُڑ کر باریش بزرگ کے پاس جا کر بھنبھنائی۔ بزرگ اپنی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اچھلے اور بغل میں دبا ہوا کاغذوں کا بنڈل زمین پر بکھر گیا۔ نیم برہنہ نسوانی حسن کو پیروں میں رُندتے دیکھ کر مسافروں نے سرد آہ بھری اور بھنچے ہوئے سینے والا مزدور جھلایا:

"حضرات، میں پوچھتا ہوں کہ غیرتِ اسلام کہاں ہے؟"

بس میں بیٹھے ہوئے بیشتر مسافر اپنے اندر ہی اندر سمٹنے لگے اور کچھ دیر کے لیے چہروں پر ناکیں ہی ناکیں پھیلتی اور سکڑتی رہیں۔ کنڈکٹر کی ناک کھڑکی کے باہر جھول رہی تھی اور اس کے نیفے میں اُڑسے ہوئے پیسوں کی مشک کچھ اور وزنی ہو گئی تھی۔ مکھی نے بس میں پُراسرار طریقے سے ہلتی ہوئی ان ناکوں کو بغور دیکھا اور ولائتی ناک والے نوجوان کے نتھنے میں گھس کر پھڑپھڑائی۔ نوجوان کے ہاتھ میں پکڑا ہوا چرس کا پیکٹ زمین پر گرا اور مسافروں نے ایک دوسرے سے خاموشی سے پوچھا:

"حضرات... ؟" اب مکھی کنڈکٹر کی گردن پر جمے ہوئے میل میں پیر گاڑے بیٹھی تھی اور پسینے والے میل کے ملے جلے ست کو چوس رہی تھی۔ کنڈکٹر نے اپنی گردن کھجائی اور ایک ہاتھ سے قمیص کا دامن جھٹکا۔ ایسا کرنے میں اس کا دوسرا ہاتھ نیفے پر جا پڑا اور نیفے کے اندر دبی ہوئی ریزگاری زمین پر بکھر گئی۔ ڈرائیور کے ہاتھ اسٹیئرنگ ویل پر کانپے اور بس بجلی کے کھمبے سے ٹکراتی ہوئی اپنی رفتار سے کچھ زیادہ تیز دوڑنے لگی۔ مکھی نے بس میں بیٹھے ہوئے مسافر کو آنکھ ماری اور سفید ٹوپی والے کے نتھنے میں گھس گئی۔ نوجوان نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی قینچی چھوڑ کر چلتی ہوئی بس میں سے چھلانگ لگائی۔ کھڑکی کے پاس کھڑے ہوئے فقیر نے "ہے کوئی سخی داتا" کی صدا کو ادھورا چھوڑا اور اپنے کرتے کی جیبیں جھاڑتا ہوا چیخ اُٹھا:

"میں لٹ گیا، میں لٹ گیا!" مکھی اب آتشیں لباس والی عورت کی گردن پر چہل قدمی کر رہی تھی۔ عورت ہاتھ اٹھا اٹھا کر مکھی کو اُڑا رہی تھی اور بس میں بیٹھے ہوئے مسافروں کی نظریں بار بار ان الجھنوں میں الجھ رہی تھیں جو بغیر آستین کی قمیص سے نظر آ رہے تھے۔ مسافروں کی ناکیں چہروں پر خود بخود سکڑتی جا رہی تھیں۔ ناکوں کے اس بتدریج پھیلنے اور سکڑنے کے عمل کو نظر انداز کرتی ہوئی مکھی ایک مرتبہ اپنی پوری طاقت اور اُڑان سے بھنبھنائی اور اڑ کر اخبار فروش کے کان کے پاس جا کر بیٹھ گئی۔ سکندر علی خان کو ابکائی آئی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے اس کا سفر ختم ہو چکا ہو یا ابھی شروع ہی نہ ہوا ہو۔ سکندر علی خان جو اپنے اس سفر کے آغاز میں اپنے نام کے ساتھ بس میں داخل ہوا تھا وہ خود اب اپنے نام سے جدا ہو چکا تھا۔ پھر یکایک باہر ہجوم میں اس نے اپنا نام تلاش کر لیا۔ ایک زبردست خواہش کے ساتھ وہ اپنی سیٹ پر سے اٹھا اور بس سے باہر نکل آیا۔ اس نے خود کو آواز دی:

"سکندر علی خان! سکندر علی خان!" خود کو پکار پکار کر اس کا حلق سوکھ گیا اور آنکھیں باہر نکل آئیں۔ اپنے اکھڑے ہوئے سانس کو قابو میں کرنے کے بعد اس نے سڑک پر بڑھتے ہوئے ہجوم پر نظر ڈالی۔ مگر اس کے اپنے اندر کا سکندر علی خان اس کی آوازوں سے بے نیاز ہاتھ میں پلے کارڈ اٹھائے جلوس میں شامل تھا اور احتجاجی نعرے لگا رہا تھا۔

آخری تعویذ

کلّو کو ڈپٹی صاحب کے بچوں نے کلّو ماموں کہنا شروع کیا تو ان کے انداز ہی بدل گئے۔ خاکی اور کالے بابو نے جب سنا تو فوراً حیات اللہ کو چڑایا۔

"ابے او سقّے کے بچے، تو مشک ہی ڈھوتا رہا اور اپنا کلوا ماموں بھی بن گیا!"

"مجھے گھروں کی نوکری پسند ہی نہیں ہے،" حیات اللہ نے جھینپ مٹاتے ہوئے کہا۔

"یہ کہہ کہ تجھے گلیوں میں بدمعاشی کرنا پسند ہے!" کلّو ماموں نے کوٹھی کے دروازے سے نکلتے ہوئے کہا۔

"بس ماما، تم میرے منھ نہ لگیو،" حیات اللہ غرایا۔

"ابے حیات اللہ، ہو جائے پھر کشتی! کلّو ماموں کو ایسی پٹخنی دیجو کہ ساری عمر یاد رکھیں،" خاکی نے حیات اللہ کو اُبھارا۔ کلّو ماموں فوراً اندر چلے گئے۔ اگر انھیں حیات اللہ سے پٹخنی ہی کھانی ہوتی تو وہ اپنا آبائی پیشہ ترک کر کے کوٹھی کی نوکری کاہے کو کرتے۔ ان کو بچپن سے اپنے ناف نلوں کا خاص خیال تھا، اس لیے جب بارہ برس کی عمر میں تلا نے ان سے اپنے ساتھ مشک اٹھوانے کی کوشش کی تو دوسرے ہی دن وہ لمبے لمبے لیٹ گئے اور وہ واویلا مچایا کہ کئی دن ملائیوں دلائیوں کے بعد بھی ان کی ناف اصل جگہ پر فٹ نہ ہو سکی۔

تلا خود تو بہت پابندی سے منھ پر کپڑا ڈالے ڈالے کوٹھی کا پانی بھرتا رہا مگر بھتیجے سے پھر

کبھی مشک نہیں اٹھوائی۔ خالہ نے جب کلو کو دیکھا تو تلا سے کہا:

"ارے تلا، یہ اپنے بھتیجے کلو کو کیوں کھلا کھلا کر ہاتھی بنا رہا ہے؟ تیری عمر اب آرام کرنے کی ہے۔ اس سے پانی بھروا۔"

"اجی یہ سالا کیا پانی بھرے گا! مشک کے بوجھ سے تو اس کی ناف سرک جاوے ہے۔"

"دیکھنے میں تو موا اچھا خاصا ہے،" ننھی خالہ نے حیرت سے لمبے چوڑے کلو کو دیکھا اور پھر بولیں:

"تو پھر اسے کوٹھی میں بھیج دیجو۔ یوں ہی چھوٹے موٹے کام کر لیا کرے گا۔"

دوسرے دن کلو ماموں دس روپے مہینا اور کھانا کپڑے پر کوٹھی میں نوکر ہو گئے۔ درجنوں بچوں کا گو موت دھوتے دھوتے اب کہیں پروبی بی کے بچے نے ان کو کلو ماموں کہنا شروع کیا تھا۔

کلو ماموں کوٹھی کی ایک اہم شخصیت تھے۔ ان کی بول چال اور رہن سہن اور طریقوں کو دیکھ کر کوئی اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ ان کا تعلق سقوں کی اس ذات سے ہے جو پشتوں سے کوٹھی کا پانی بھرتے چلے آ رہے ہیں۔ وہ اپنے چچا تلا اور چچازاد بھائی حیات اللہ کو کمر پر بھاری بھاری مشکیں اٹھاتے ہوئے دیکھتے تو دل میں سوچتے:

"مجھ میں کہاں مشک اٹھانے کا بُوتا ہے!"

کلو ماموں کچھ ایسے دھان پان تو نہ تھے۔ خوب لمبے چوڑے تندرست اور توانا۔ برسوں سے کوٹھی کا اچھا کھانا کھا رہے تھے اس لیے جسم پر چربی کی تہہ بڑھتی جا رہی تھی۔ کالا سیاہ رنگ روز بروز چمک دار ہو رہا تھا۔ پور پور میں انگوٹھی چھلّے پہنے، ہاتھوں میں مہندی لگائے، ہونٹوں پر پانوں کی دھڑی جمائے کلو ماموں ہمیشہ نوک پلک سے درست رہتے تھے۔ شادی کی تاریخ ان کے ذہن میں محفوظ نہیں تھی مگر شاید وہ پیدائشی شادی شدہ تھے۔ بیوی کا ذکر ایسے چاؤ سے کرتے کہ بچوں کو ان کی بیوی کو دیکھنے کی تمنا بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

"اللہ کلو ماموں، آپ کی بیوی کیسی ہیں؟" رانو ان کے گلے میں باہیں ڈال کر پوچھتی۔

"ہم نے ابھی اُن کو دیکھا تھوڑی ہے۔" کلو ماموں جواب دیتے۔ کوٹھی میں رہتے رہتے ان

کے لہجے میں شائستگی آ گئی تھی۔ وہ بیوی کا ذکر بڑے ادب سے کرتے۔

"کیوں نہیں دیکھا؟" منو میاں آنکھیں پھاڑ کر پوچھتے۔

"ہم سے پردہ جو کرتی ہیں،" کلو ماموں جواب دیتے۔

"اچھا، نام کیا ہے؟" رانو اپنے اشتیاق کو کم کرنے کے لیے صرف نام پوچھ کر تسلی کرنا چاہتی۔

"اشراف اپنی بیویوں کے نام نہیں لیتے ہیں،" کلو ماموں کہتے۔

"اچھا، پھر کسی دن لائیں گے نا؟" منو میاں کا شوق بڑھتا جا رہا تھا۔

"چنی بٹیا کی شادی پر آئیں گی،" کلو ماموں بچوں کو تسلی دیتے۔

کلو ماموں ہر سنیچر کی رات کو اپنے گھر جاتے۔ رات کو نو بجے کام کاج سے فراغت حاصل کرنے کے بعد وہ جانے کی تیاری میں لگ جاتے۔ گھنٹوں غسل خانے سے پانی کے گرنے کی آوازیں آیا کرتیں۔ اس کے بعد سفید جھک لباس پہن کر، کوئی بہت خوشبودار قسم کا عطر لگا کر، سر میں آدھا پوا چنبیلی کا تیل چپڑ کر جب وہ دروازے سے نکلتے تو ننھی خالہ کا چھینکتے چھینکتے برا حال ہو جاتا۔

"کم بخت پوری عطر کی شیشی انڈیل کر گیا ہے۔"

صبح مرغ کی اذان سے پہلے وہ کوٹھی کے دروازے پر موجود ہوتے۔ گھر میں بیوی جنت کے ہوتے ہوئے بھی ان کا دل نہ لگتا تھا۔ بیوی کیا تھی دس گیارہ برس کی ایک یتیم ویسیر بچی تھی جس کو کلو ماموں کی ماں نے بچپن سے پالا تھا۔ ان کی ماں کو وہ سگی بچیوں کی طرح پیاری تھی۔ چھوٹا سا گھونگھٹ نکالے گھر کا سارا کام کر لیا کرتی تھی۔ رات کے اندھیرے میں بھی کلو ماموں نے کبھی اس کا گھونگھٹ پلٹنے کی کوشش نہیں کی۔ بس وہ اس کو دور ہی دور سے دیکھ کر خوش ہوا کرتے تھے۔

"سیانی ہو گی تب بات بنے گی،" وہ کروٹ لے کر سو جاتے۔

ابھی جنت بی بی کو میٹھا برس لگنے میں پورے چھ مہینے باقی تھے کہ کلو ماموں کو اولاد کے غم نے پریشان کرنا شروع کر دیا۔ رمضان قریب تھا کوٹھی کے پچھواڑے کی مسجد میں ملا غفور آ گئے

تھے۔ یہ ملاجی صرف رمضان میں نظر آتے تھے۔ کوٹھی کی افطاری کھانے کے بعد ایسی پرسوز آواز میں اذان دیتے تھے کہ روزہ داروں کی دن بھر کی تھکن دور ہو جاتی۔ کلوماموں بھی بڑی پابندی سے ان کے پاس جانے لگے اور کچھ دن بعد کالے ڈورے میں پڑے ہوئے تین چار تعویذ ان کے گلے میں لٹک گئے۔

"اے ہے یہ تعویذ کیوں پہنے ہیں؟" ننھی خالہ سے صبر نہ ہو سکا اور انھوں نے پوچھ ہی لیا۔
کلوماموں ایسے بے شرم تو نہ تھے کہ صاف بتا دیتے۔ آئیں بائیں شائیں کر کے رہ گئے۔ مگر ان کے طور طریقوں سے ننھی خالہ نے بھانپ لیا کہ وہ کچھ فکرمند ہیں۔
بھابی کی چارپائی مہینوں سے جھولا سی ہوئی تھی۔ رات کو دو بچوں کو لے کر سوتی تھیں۔ سارا کھانا سینے پر رکھا رہتا تھا۔ مگر دن میں یاد ہی نہیں رہتا تھا کہ ادوائن کھنچوا لیں۔ کلوماموں جب شام کو بستر کرنے لگے تو انھوں نے بڑی لجاجت سے کہا:
"ارے کلو ذرا اس کی ادوائن بھی کھینچ دیجو۔ جھولا سی چارپائی پر سوتے سوتے ساری پسلیاں دکھنے لگی ہیں۔"

"نا بھابی، میں رات کو ادوائن نہیں کھینچوں گا، کا نڑی لونڈیا پیدا ہو گی۔" انھوں فوراً انکار کر دیا۔

"کیا جنت کے ہاں بچہ ہونا ہے؟" ننھی خالہ نے اشتیاق سے پوچھا۔
"ایسی کہاں قسمت!" کلوماموں نے سرد آہ بھر کر کہا۔
"اے ہے، ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے!" ننھی خالہ نے کہا۔
"عمر تو اچھی خاصی ہے۔ رمضان شریف کی گیارھویں تاریخ کو بارھواں پورا کر کے تیرھویں میں لگ جائیں گی۔" کلوماموں کو جنت کی عمر کا ایک ایک لمحہ یاد تھا۔
"یہ تو مسجد میں دوڑ دوڑ کر کیوں جاوے ہے؟" ننھی خالہ نے پوچھا۔
"ملاجی نے وظیفہ بتایا ہے۔ کل سے شروع کروں گا،" کلوماموں نے کہا۔
"ان ملا سیانوں کے پیچھے لگ کر کیوں اپنی اوقات گنوا رہا ہے؟ اولاد قسمت میں ہو گی تو ہو ہی جائے گی۔ ملاجی کون سا ایسا تیر بہدف وظیفہ بتائیں گے! ستیاناس کر دیں گے تیرا۔"

"نا خالہ جی، ملاجی ایسے نہیں۔ انھوں نے اس بدذات حیات اللہ کو بھی اللہ والا بنا دیا۔ پانچوں وقت کی نماز پڑھنے لگا ہے۔" کلو ماموں ملاجی کے خلاف ایک لفظ بھی سننے کو تیار نہیں تھے۔

کلو ماموں کچھ ایسے رکھ رکھاؤ سے رہتے تھے کہ دوسرے سقوں کو بھی اپنے پیشے سے نفرت ہوتی جا رہی تھی۔ حیات اللہ جو نو برس کی عمر سے مشک اٹھا رہا تھا اب پانی بھرنے میں ٹال مٹول کرنے لگا تھا۔ جہاں تلا کی نظر بچی وہ مشک اور ڈول کنویں کی مینڈھ پر چھوڑ ملاجی کے حجرے میں گھس جاتا۔

کلو ماموں کو تو خیر ناف نلوں کی کمزوری تھی اس لیے مشک اٹھانے سے بچ گئے، مگر حیات اللہ کو تو وہ چار چوٹ کی مار پڑتی تھی کہ سارے پلے داروں کے بچے جمع ہو جاتے۔ لیکن حیات اللہ یہی دہائی دیتا رہتا:

"میں تو کوٹھی میں نوکری کروں گا۔"

عصر کی نماز کا وقت تھا۔ مسجد نمازیوں سے بھری ہوئی تھی۔ باہر بڑے چبوترے کے برابر لڑکوں کا ہجوم لگا ہوا تھا۔ حیات اللہ پٹ رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب مسجد سے نکلے تو انھوں نے یہ تماشا دیکھا۔

"ارے کیوں مارتا ہے؟" انھوں نے تلا سے پوچھا۔

"اجی ڈپٹی صاحب، یہ تو میری عجت سے کھیل رہا ہے۔ کام تو کرتا نہیں ہے۔ کھوے ہے کوٹھی میں کام کروں گا۔"

"کیا ہرج ہے۔ چل بے حیات اللہ، میرے ساتھ چل!" یہ کہتے ہوئے ڈپٹی صاحب حیات اللہ کا ہاتھ پکڑے ہوئے کوٹھی میں لے آئے۔

کوٹھی کے پچھلے حصّے میں بڑی بھابی رہتی تھیں۔ ان کو اوپر کے کام کے لیے ایک لڑکے کی ضرورت تھی۔ انھوں نے حیات اللہ کو خوشی سے رکھ لیا۔

کلو ماموں اور حیات اللہ ہم عمر تھے مگر جو شستگی اور رکھ رکھاؤ کلو ماموں میں تھا حیات اللہ کو اس سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ جس وقت حیات اللہ کوٹھی میں آیا کلو ماموں ڈپٹی صاحب کے بچوں کے ساتھ دوسرے شہروں کی سیر پر گئے ہوئے تھے۔ اس مرتبہ جو یہ سیر سے پلٹے تو پاجامے

کی جگہ پتلون نے اور کرتے کی جگہ کالروالی قمیص نے لے لی۔ جب شبو نے سرخ ٹائی ان کے گلے میں باندھی تو اشرف نے اپنا سفید ہیٹ ان کے سر پر رکھ دیا۔ ان کے برسوں کی مراد بر آئی۔ اسٹیشن پر ایسی شان سے اترے کہ ان کے آگے ڈپٹی صاحب بھی نہیں جچ رہے تھے۔ جیسے ہی تانگا کوٹھی کے گردو نواح میں پہنچا لڑکوں کی پوری پلٹن نکل آئی۔ کالا بابو چیخا:

"ابے حیات اللہ! دیکھیو ذرا، کلوا تو ڈپٹی بن آیا۔" حیات اللہ نے حیرت سے دیکھا اور کٹ کر رہ گیا۔

"یہ کلوا تو بڑھتا ہی جا رہا ہے،" اس نے دل میں سوچا۔ "مگر بچو، میں بھی اس ذلت کا بدلا لے کر رہوں گا،" وہ بڑبڑایا۔

بڑی بھابی کے اپنے تو کوئی اولاد تھی نہیں۔ وہ حیات اللہ کو بہت اچھی طرح رکھتیں۔ اچھے سے اچھا کھانے کو ملتا۔ مگر جہاں ان کی نظر بچی حیات اللہ پتیلی میں سے گردہ نکال کی چٹ کر جاتا یا پاندان کی کلیا میں پڑے ہوئے پیسے نیفے میں اڑس لیتا۔ وہ کچھ دن تک در گزر کرتی رہیں مگر جب ایک دن اکٹھے دس روپے لے کر وہ دن بھر کے لیے غائب ہو گیا تو انھوں نے اس کو سزا دینے کا ارادہ کیا اور کلو ماموں سے کہا کہ کوٹھری سے رسی نکال کر دالان کے کنڈے میں باندھ دیں۔ کلو ماموں کنڈے میں رسی ڈالتے جاتے اور قمیص کی آستین سے آنکھوں کو خشک کرتے جاتے۔

"اے ہے تیرے دل میں کاہے کو درد ہو رہا ہے؟" ننھی خالہ نے کلو ماموں سے پوچھا۔

"اجی خالہ جی، اپنا ہی بھائی ہے۔ برا کام کرے گا تو ساری سقوں کی قوم کی بدنامی ہے۔ مگر حیات اللہ چور نہیں ہے،" انھوں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔

"تو پھر روپے کیا فرشتے لے گئے؟" بڑی بھابی نے تخت پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

شام کو حیات اللہ ہونقوں کی شکل بنائے داخل ہوا تو سب سے پہلے کلو ماموں ہی سے مڈبھیڑ ہوئی مگر وہ کنی کاٹ گئے۔ وہ تو اس وقت کے تصور سے ہی کانپ رہے تھے جب حیات اللہ کو رسی کے ساتھ لٹکایا جائے گا۔ ادھر حیات اللہ بہادری اور سینہ زوری سے اس سزا کو جھیل گیا۔ ہر گھونسے پر یہی کہتا رہا:

"ایمان سے بھابی جی، میں نے نہیں لیے۔" دوسری طرف کلو ماموں گھٹنوں میں منھ دیے

روتے رہے اور سوچتے رہے۔

"کم بخت کو جانے کب عقل آئے گی؟ اس پر ملاجی کی صحبت کا الٹا اثر ہو رہا ہے۔" بات یہ تھی کہ کلو ماموں کے نماز روزے میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا اور اب تو وہ عشا کی نماز کے بعد گھنٹوں سجدے میں پڑے رہتے تھے۔ یہ وظیفہ وہ اتنی پابندی سے پڑھ رہے تھے کہ اکثر سنیچر کی رات کو گھر جانا بھی بھول جاتے تھے، حالاں کہ جنت بی بی کا بیٹھا برس پورا ہو چکا تھا اور وہ اچھی خاصی سیانی ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ بڑی بے چینی سے سنیچر کی رات کو کلو ماموں کا انتظار کرتیں اور جب وہ نہ آتے تو منھ لپیٹ کر پڑ رہتیں۔ صبح کو کام کرنے میں بھی ان کا دل نہ لگتا۔ وہ شرما شرما کر ماں سے کہتیں:

"اماں، ذرا کوٹھی جا کر خیر سلا تو معلوم کر۔"

"ماں رات کے اندھیرے میں سفید لٹھے کی چادر کو بڑے پُراسرار طریقے سے اپنے گرد لپیٹتی ہوئی کوٹھی میں داخل ہوتی اور نماز کی چوکی پر بیٹھے ہوئے ماموں سے کہتی:

"ارے کلوے، تو گھر کیوں نہ آیا؟ جنت راہ دیکھتی رہی ہے۔"

"اماں اس کی تسلی کر دیجو۔ اگلے سنیچر تک وظیفہ ختم ہو جائے گا۔ جب ہی ملاجی نے گھر جانے کو بتایا ہے۔"

خدا معلوم وظیفوں نے زور دکھایا یا کیا، بہر حال محرم شروع ہونے میں پندرہ دن باقی تھے کہ جنت بی بی کے ہاں بیٹا پیدا ہو گیا۔ محلّے کے سارے لڑکوں نے مٹھائی مانگ مانگ کر کلو ماموں کا ناک میں دم کر دیا۔ کالے بابو نے اپنا مخصوص فقرہ دہرایا:

"ابے حیات اللہ تو وہی کا وہی رہا یہ کلوا ابا بھی بن گیا۔"

"میں بھی کچھ بن ہی جاؤں گا،" حیات اللہ نے خالص فلسفیانہ انداز میں کہا۔

"سالا ڈاکو بنے گا،" کلو ماموں نے حقارت سے کہا۔

"بس ابا میاں، تم خاموش رہو۔ بیٹے کے زعم میں مت رہنا۔ ایسے ایسے ہزار بیٹے پیدا کر کے رکھ دوں۔"

"پیارے، بیوی تو ہے نہیں، بیٹے کہاں سے پیدا کرو گے؟" خاکی نے اپنے پیلے پیلے دانت

نکال کر پوچھا۔

"یہ تو تُو نے پتے کی بات کہی۔ خیر دیکھا جاوے گا،" حیات اللہ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

اس مرتبہ بڑی بھابی کی مار نے حیات کو اچھا خاصا سُدھار دیا تھا۔ لپک جھپک کر سارا کام کر لیتا۔ کچھ ذمے داری کا احساس بھی پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ سنیچر کی رات تھی۔ کلو ماموں گھر گئے ہوئے تھے۔ جیلر صاحب کی بیوی نے کوٹھی والیوں کو خاص طور سے مدعو کیا تھا مگر سوال یہ تھا کہ چھوٹی بچیوں کو کس پر چھوڑا جائے۔

"سب چلو۔ بچیوں کے پاس حیات اللہ رہے گا،" بڑی بھابی نے مشکل آسان کی۔

"ہاں، بھابی جی تم اطمینان رکھو،" قریب کھڑے ہوئے حیات اللہ نے کہا۔

اسی رات کچھ دیر بعد میدان صاف پا کر حیات اللہ آہستہ آہستہ صندوقوں کی کوٹھری میں گیا، جیب سے نئی بنی ہوئی چابی نکالی، بڑی بھابی کا کالا بکس کھول کر زیور کی صندوقچی بغل میں دبالی اور دروازے کی چٹخنی کھول کر اندھیرے میں روپوش ہو گیا۔

اس واقعے کو تین چار سال گزر گئے۔ حیات اللہ پھر نظر نہیں آیا۔ تلا غریب کی تو اس کے جانے سے کمر ٹوٹ گئی۔ ماں نے روتے روتے آنکھیں پھوڑ لیں۔ ڈپٹی صاحب نے اِدھر اُدھر پتا چلانے کی کوشش کی مگر اس کا سراغ نہ مل سکا۔ کلو ماموں کبھی تنہائی میں بیٹھ کر سوچتے:

"ڈوب مرا ہو گا۔ آخر تھا تو اصل نسل بہشتی کی اولاد۔ کہاں تک ذلت برداشت کرتا؟" اسی رواروی میں بہت سے سال گزر گئے۔ کوٹھی والے کوٹھی چھوڑ کر کراچی آ گئے۔ کلو ماموں تو کوٹھی والوں کے ساتھ تھے۔ ان کا خاندان بھی یہیں آ کر بس گیا۔

کلو ماموں کا بیٹا نور محمد اب سیانا ہو گیا تھا اور اب کلو ماموں اس پھیر میں پڑے ہوئے تھے کہ پھر کوئی وظیفہ پڑھیں اور اس کا کرشمہ دیکھیں۔ مگر یہ کراچی کا گھر اس قدر بے ڈھنگی جگہ واقع تھا کہ فیشن ایبل دکانوں کے علاوہ دور دور بھی کوئی مسجد نظر نہیں آتی تھی۔ ان کو ملا غفور کے کشف و کرامات رہ رہ کر یاد آتے اور وہ دل مسوس کر رہ جاتے۔

"بلا سے وہیں رہ جاتے، اولاد کے لیے تو نہ ترسنا پڑتا!" وہ اکثر سوچتے۔

اس مرتبہ سنیچر کی رات وہ اپنی جھگی میں پہنچے تو وہاں ایک پُراسرار خاموشی طاری تھی۔ بس کبھی کبھی "یاقدوس یاقدوس" کے زبردست نعروں سے ماحول کا سکوت ٹوٹ جاتا تھا۔ کلو ماموں یہ سوچ رہے تھے کہ جھگی میں داخل ہوں یا نہیں کہ جنت بی بی نے منھ پر انگلی رکھ کر ان کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پچھواڑے کی طرف سے جھگی میں لے آئیں۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں پیٹھ موڑے ہوئے ایک سائے کو بے حس و حرکت بیٹھے ہوئے دیکھا تو ان کو اور بھی حیرت ہوئی۔ سامنے جو گئے تو حیات اللہ مع اپنی لمبی سیاہ ڈاڑھی کے سجدہ ریز تھا۔ حیات اللہ نے سجدے سے سر اٹھایا اور کلو ماموں کی طرف توجہ کیے بغیر لمبے چمک دار چاقو کو کھولا اور اس کے پھل پر نظریں جما دیں۔ کلو ماموں کے لیے یہ سب باتیں بڑی حیرت انگیز تھیں۔

"سنو ہو! اپنا حیات اللہ پیر ہو گیا ہے،" جنت بی بی نے کہا۔

"اچھا، مگر کیسے؟" کلو ماموں نے حیرت سے پوچھا۔

"پتا نہیں، کچھ بتائے تھوڑی ہے۔ بس چاقو کے پھل میں دیکھ کر سب سچ سچ بتا دیوے ہے،" جنت بی بی نے سرگوشی کی۔

"اچھا!" کلو ماموں کی حیرت بڑھتی جا رہی تھی۔

"جب سے آیا ہے سجدے میں پڑا ہے،" جنت بی بی نے کہا۔

"اللہ کی مہربانی ہے۔ آخر کو ہے تو شریف کی اولاد، سدھر گیا۔"

کلو ماموں نے اطمینان کا سانس لیا مگر چچا تلا کو یاد کر کے ان کا کلیجا کٹنے لگا۔

"کاش! وہ یہاں ہوتا تو بیٹے کو دیکھتا،" کلو ماموں نے افسوس کے ساتھ سوچا۔

حیات اللہ پیر کیا بن کر آیا کہ کلو ماموں کے ہاں ہن برسنے لگا۔ پورے محلّے کی عورتیں ڈھل ڈھل کر پیر جی کے حضور میں آتیں۔ روپیہ دو روپے بطور نذرانہ لے کر پیر جی ان کو ایسے تعویذ دیتے کہ کوئی دوسرا پیر دس روپے میں بھی نہیں دیتا ہو گا۔ کلو ماموں نے جنت بی بی کو خاص تاکید کر دی تھی کہ حیات اللہ کے کھانے پینے کا خاص خیال رکھیں۔

"اسی کی برکت سے شاید اللہ ہمیں اولاد دے،" انھوں نے جنت بی بی کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

"تم کہو تو میں بھی تعویذ کروالوں،" جنت بی بی نے پوچھا۔
"معلوم نہیں دے گا بھی یا نہیں۔ وہ تو قوم کی خدمت کر رہا ہے اور یہی بڑے پیر کی نشانی ہے۔"

"کل اتوار ہے۔ جمعہ کو نہا دھو کر بات کروں گی،" جنت بی بی نے کہا۔
صبح کلو ماموں جب ڈپٹی صاحب کے گھر پہنچے تو چنی بٹیا پھکوں پھکوں رو رہی تھیں۔ ابھی ابھی دسویں کا نتیجہ نکلا تھا اور چنی بٹیا بچاری امتحان میں فیل ہو گئی تھیں۔ چنی بٹیا کو کلو ماموں نے تقریباً پالا تھا۔ یوں جوان کو روتے دیکھا تو کلیجا منہ کو آ گیا۔
"نہ رو، بٹیا، میرے گھر چلیو۔ حیات اللہ سے پاس ہونے کا تعویذ لے آئیو۔"
"اے ہے، یہ حیات اللہ کہاں سے آ گیا؟" ننھی خالہ نے سلام پھیر کر پوچھا۔
"خالہ جی، حیات اللہ پیر ہو گیا ہے۔ بڑے اچھے اچھے تعویذ کر رہا ہے۔ ساری محلّے کی عورتیں اس کو گھیرے رہتی ہیں۔"

"ارے ہٹ! وہ بدمعاش اب کوئی اور سوانگ رچائے گا،" ننھی خالہ نے کہا۔
"نہ خالہ جی، وہ عورتوں کو نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ بس اپنے چلّو کے جل پر نظر رکھ کر سب حال بتا دیوے ہے۔"
"کلو ماموں، میں ضرور چلوں گی،" چنی بٹیا رونا دھونا بھول کر تعویذ لانے کے لیے تیار ہو گئیں۔

"کیوں دیوانی ہوئی ہے چنی! ایسے ایسے پیروں کی بھلی چلائی،" ننھی خالہ نے کہا۔
محلّے کی عورتیں واقعی پیرجی کو گھیرے رہتی تھیں۔ عورتوں کے پوشیدہ امراض کو تو وہ صرف اپنا ہاتھ رکھ کر دور کر دیا کرتے تھے۔ بس منہ ہی منہ میں کچھ بدبداتے۔ آنکھیں بند کر کے ہاتھ عورت کی کمر پر رکھتے تو وہ بچاری لرز جاتی مگر پیرجی کے رعب سے دم سادھے بیٹھی رہتی۔ کلو ماموں کی جھگی کے قریب ہی بلاقن کی جھگی تھی۔ بلاقن کی جوان بیٹی شہزادی کو جانے کیا مرض تھا۔ بس گم سم رہتی۔ ہنسنا بولنا سب چھوٹا ہوا تھا۔ پیرجی سے بات کی تو کسی بدروح کا اثر بتایا اور کہا کہ جمعہ کو نہلا دھلا کر بھیجنا۔ دوسرے دن بلاقن شہزادی کو لے کر آئی۔ چودہ پندرہ سال کی

معصوم سی لڑکی پھٹی پھٹی حیران نگاہوں سے پیرجی کو تکنے لگی۔ پیرجی نے نظر اُٹھا کر لڑکی کو بغور دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے اس کی کمر پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ شہزادی کھلکھلا کر ہنس پڑی اور دور جا کر کھڑی ہو گئی۔

"اری چل نا!" بلاقن نے پیرجی کی خوف زدہ آنکھوں سے سہم کر شہزادی کو گھسیٹا۔

"نا ہم نا جاتے۔ ہمارے گد گدی ہوتی ہے،" یہ کہہ کر وہ اپنی جھگی میں بھاگ گئی۔

"شاہ جی، بڑی حرافہ ہے،" بلاقن نے افسوس کے ساتھ کہا۔

"بچی ہے۔ سمجھا بجھا کر پھر بھیجیو!" پیرجی نے ہاتھ ملتے ہوے کہا مگر شہزادی پھر کبھی نہ آئی۔

جنت بی بی رات دن پیرجی کے بڑھتے ہوے عقیدت مندوں کو دیکھتیں اور دل مسوس کر رہ جاتیں۔ واقعی پیرجی کو گھر اور دولت کی کچھ پرواہ نہیں تھی۔ دن بھر میں جو کچھ بارہ پندرہ روپے جمع ہوتے انھیں دیکھے بغیر جنت بی بی کی ہتھیلی پر رکھ دیتے۔ کلوماموں کی ماں کہتی:

"کچھ خرچے کے لیے لے لو۔"

"ہمارا خرچہ خدا خود پورا کرتا ہے۔" وہ آسمان پر انگلی اٹھا کر کہتے۔

"ذرا بہو پر دم درود کر دیا کرو،" ایک دن کلوماموں کی ماں نے ذرا دبی زبان سے کہا۔

"کیا تکلیف ہے؟" پیرجی نے جنت بی بی کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

"تکلیف تو کچھ نہیں، بس نور محمد بڑا ہو گیا ہے،" کلوماموں کی ماں نے نور محمد کی طرف اشارہ کر کے جواب دیا۔

"اولاد دینا خدا کا اپنا اختیار ہے،" پیرجی نے بے تعلقی سے کہا۔

"مگر پیر فقیر کی دعا میں بھی بڑا اثر ہوتا ہے،" کلوماموں کی ماں نے جواب دیا۔

"ہوں،" انھوں نے زور سے ہنکارا بھرا۔ چاقو کھول کر قریب بیٹھی ہوئی جنت بی بی کے ماتھے پر لگایا اور پھر سر جھکا کر بیٹھ گئے۔

"رات کو عشا کے بعد آنا،" انھوں نے جنت بی بی سے کہا اور جنت بی بی عشا کے بعد کنگھی چوٹی سے لیس ہو کر پیرجی کی خدمت میں پہنچ گئیں۔ پھر روز کا معمول ہو گیا۔ کھانے وغیرہ

سے فراغت حاصل کرنے کے بعد دم درود کروانے پہنچ جاتیں۔

کلو ماموں جو ایک سنیچر کو گھر پہنچے تو جنت بی بی نظر نہ آئیں البتہ پیرجی کی کوٹھری سے کچھ سرگوشیوں کی آواز آرہی تھی۔ اماں نے بتایا:

"دم کروانے گئی ہے۔ اور ہاں، تجھے بھی تو تعویذ دیے ہیں ساتھ لے جائیو۔ صبح نہار منہ پانی میں گھول کر پی لیا کیجیو۔"

کلو ماموں کے چہرے سے تمام تفکرات ایک دم غائب ہو گئے۔ بیوی کا انتظار کیے بغیر وہ مطمئن ہو کر سو گئے۔

کلو ماموں بڑی عقیدت اور پابندی سے ایک ایک تعویذ گھول کر پیتے رہے۔ ابھی ان کا آخری تعویذ ختم نہ ہوا تھا کہ صبح صبح نور محمد ہانپتا کانپتا کوٹھی آیا اور کہنے لگا:

"ابا، اماں تو پیرجی کے ساتھ چلی گئی۔"

کلو ماموں کے ہاتھ سے تعویذ گھلا ہوا پانی کا کٹورا چھوٹ گیا۔ انھوں نے نور محمد کے گال پر بھرپور چانٹا مارا اور بولے:

"سالے نے سارے تعویذوں کا اثر غارت کر دیا۔ آخری تعویذ ہی تو سب کچھ ہوتا ہے۔"

اصحاب الشمال

ہفتے میں صرف ایک دن جدید وضع سے سجے ہوئے ڈرائنگ روم کو دوسرے انداز سے ترتیب دیا جاتا۔ سامنے دیوار پر لگا ہوا مونالیزا کا لافانی مسکراہٹ والا فریم جس میں مسکراہٹ سے زیادہ اس کے سینے کا بالائی حصہ نمایاں تھا، اس کو پلٹ دیا جاتا۔ کارنس پر رکھا ہوا گوتم کا مجسمہ، ایفل ٹاور، سوئٹزرلینڈ کے قدرتی مناظر، ننگے جسم اور عریاں پنڈلیاں، پیرس کی رقاصاؤں کے مومی بت، مچھلی کا سر، تنکوں سے بنا ہوا دخانی جہاز، بھوسا بھرا ہوا ننھا منا ہرن اور مشرقی پاکستان کے چائے کے باغات میں ٹوکریاں سنبھالے ہوئے بنگال کی حسینائیں، سب پر لمبی لمبی نقابیں ڈال دی جاتیں۔ کونے کی میز پر رکھے ہوئے ٹیلی وژن سیٹ کو تابوت کی شکل دینے کے لیے اس پر سفید غلاف منڈھ دیا جاتا۔ جھالر والے دیوان پر سے مُردہ جانوروں کے پروں والے کشن ہٹا کر گاؤتکیہ رکھا جاتا اور کمرے کی تمام جدید وضع کی روشنیاں گل کر کے درمیان میں لگا ہوا فانوس جلا دیا جاتا۔

کمرے میں ایک دبیز اور خواب ناک سی فضا قائم ہو جاتی۔ گھر کے افراد اور ان کے رشتے دار تقدس اور پاکیزگی کا جذبہ لیے ہوئے کمرے میں داخل ہوتے۔

دن کو اس انوکھے انداز میں گزارنے کا خیال گھر کے بزرگ کو اچانک ہی آیا تھا۔ لادینی اور بے راہ روی کا دھارا ایسا اندھا دھند بہہ رہا تھا کہ کبھی بھی قیامت آسکتی تھی۔ لوگوں کو راہ راست پر لانے کی یہ ایک معمولی سی کوشش تھی جو گھر سے شروع ہو کر اب آہستہ آہستہ پورے خاندان پر اپنا

اثر کر رہی تھی۔ ہفتے بھر کے ہنگاموں سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد لوگ وقت مقررہ پر پہنچ جاتے۔ عورتیں سروں پر ساریوں کے پلو سنبھال کر اور اپنے نیم عریاں بازوؤں کو ڈھک کر بیٹھ جاتیں اور مرد رومال اور ٹوپیوں سے اپنے سر ڈھانپ لیتے اور کمرے کی خاموش کو توڑتی ہوئی ایک آواز ابھرتی۔

''پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے۔ گویا وہ پتھر ہیں یا ان سے بھی زیادہ سخت۔ حالاں کہ بعض پتھر ایسے ہوتے ہیں کہ ان سے چشمے پھوٹ نکلتے ہیں اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ پھٹ جاتے ہیں اور ان سے پانی نکلتا ہے اور بعض ایسے ہوتے ہیں کہ خدا کے خوف سے گر پڑتے ہیں۔ اور اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں۔''

آواز وسیع اور گہرے سناٹے میں پھیلتی کمرے میں بیٹھے ہوئے درجن سوا درجن افراد کن انکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے۔ چبھتی اور ٹٹولتی نظریں ایک دوسرے کے سینے میں گھس کر تلاش شروع کر دیتیں اور دوسرے ہی لمحے گھبرا کر پلٹ آتیں۔ ان کے دل خوف سے لرز اٹھتے۔ پھیلتے ہوئے سناٹوں میں دلوں کی ٹھکا ٹھک ابھر ابھر کر ایک دوسرے کو دہلانے لگتی۔ چہرے سب کے نیچے کی طرف لٹک جاتے۔ پیشانیاں ندامت کے پسینے سے بھیگ جاتیں اور گردنیں شرمساری سے جھک جاتیں کہ پھر فضا میں وہی آواز اُبھرتی۔

''کیا وہ لوگ نہیں جانتے کہ حق تعالیٰ کو سب خبر ہے۔ ان چیزوں کی جن کو وہ مخفی رکھتے ہیں اور ان کی بھی جن کا وہ اظہار کرتے ہیں۔ کیا انسان، حشر نشر کا منکر شخص، یہ خیال کرتا ہے کہ ہم اس کی ہڈیاں ہر گز جمع نہیں کریں گے؟ کیوں نہیں، ہم اس پر قادر ہیں کہ اس کی انگلیوں کے پوروں تک کو درست کر دیں۔''

آواز بتدریج بڑھتی، پھیلتی، کانوں سے ٹکرا کر دل میں گرم گرم برمے کی طرح پڑتی۔ عجز و نیاز سے جھکی ہوئی گردنیں کچھ اَور جھک جاتیں اور وہ سب سراسیمگی سے اِدھراُدھر دیکھتے۔

پرائیویٹ کمپنی میں کام کرنے میں جہاں بہت سے فائدے ہیں ـــــ مالی منفعت، روپے کی بچت، فارغ البالی اور خوشگوار مستقبل ـــــ وہاں ایک نقصان بھی ہے: مذہب کا زیاں... عنایت حسین کے نتھنے کانپے اور انھوں نے چور نگاہوں سے اپنی بیوی کو دیکھا۔ بیوی کا وقار اور حسن اس

لمحے عذاب بن کر ان کے احساسات پر چھا گیا۔
نائلہ حسین جس سوسائٹی میں اٹھتی بیٹھتی تھی وہ شہر کی اعلیٰ سوسائٹی تھی۔ وہ حسن اور دلکشی کا ایسا شاہکار تھی جو وقت کے ساتھ ساتھ مکمل ہو رہا تھا۔ گزرتا ہوا ہر لمحہ اس کے حسن میں کچھ نہ کچھ اضافہ ہی کر رہا تھا۔ مردوں کی محفل میں اس کا ذکر چسکیاں لے لے کر کیا جاتا تھا۔ اس کی شخصیت میں کچھ ایسی کھٹی میٹھی گولی کا سا مزہ تھا کہ دیکھنے کے بعد ضرور ہی چٹخارہ لینے کو طبیعت مچل اٹھتی تھی۔ مرد تو مرد، عورتیں تک اس کا ذکر بڑی حسرت کے ساتھ کرتی تھیں۔ خود نائلہ کی طبیعت میں بڑا سلجھاؤ اور انداز میں بڑا رکھ رکھاؤ تھا۔ اپنے ملنے والوں میں اسے ایک خاص مقام حاصل تھا۔
عنایت حسین نے اس کے چہرے پر ایک اچٹتی نظر ڈالی۔ کمرے کے بدلے ہوئے ماحول میں وہ انھیں کوئی اور ہی چیز نظر آئی۔ پور پور کی پردہ پوشی کا خیال ان کے سینے میں ڈنک مارنے لگا۔ نائلہ نے اپنے بالوں کے ابھار پر ہاتھ پھیرا پھر اونچے اور پیٹ کے ابھار پر سے اٹھے ہوئے بلاؤز کو کمر کے ساتھ لگایا اور نیم عریاں بازوؤں کو ساری کی لپیٹ میں لے کر پورا کا پورا ڈھک لیا۔ اس کی سیاہی مائل بھوری آنکھیں پھیل کر ارد گرد کے ماحول کو ڈھانپتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔ کمرے میں بیٹھے ہوئے درجن سوا درجن افراد نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں۔
"کم بخت یہ درزی..." اس نے بے چین ہو کر اپنے پیٹ سے اوپر چڑھے ہوئے بلاؤز کو نیچے کھسکاتے ہوئے درزی کو کوسا۔
بچوں کی پیدائش کے بعد جسم عجیب بے ڈھنگا ہو کر رہ گیا تھا۔ اوپر سے آئے دن نت نئے فیشن، کمپنی کی نوکری اور اعلیٰ سوسائٹی۔ دین ایمان سلامت رہے بھی تو کیسے۔
"نوکری چھوڑی بھی تو جا سکتی ہے،" ایک خیال پر پھڑپھڑاتا ہوا ذہن پر جھپٹا سا مار کر گزر گیا۔
"اچھی نوکریاں ملتی کب ہیں؟" ایک اور خیال ذہن پر پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا۔
اس نوکری کو حاصل کرنے کے لیے عنایت حسین کو بہت زیادہ دوڑ دھوپ کرنا پڑی تھی۔ بڑی بڑی سفارشیں حاصل کی تھیں۔ سیکرٹریوں اور وزیروں تک پہنچ تھی نائلہ کے باپ کی۔ نوکری بھی کیسی: شاہانہ ٹھاٹ، ڈنر، پارٹیاں، اور اونچی اونچی باتیں... سالِ نو کے ڈنر پر نائلہ نے ستاروں

دہلی ہرے رنگ کی ساری پہنی تھی جو اس کی سفید رنگت پر بے طرح کھل رہی تھی۔ اس دن میزبانی کے فرائض بھی نائلہ نے بڑے سلیقے سے انجام دیے تھے۔ فضا میں عجیب طرح کی مہک تھی۔ گلاسوں کی گردش اور پس منظر سے آہستہ آہستہ بلند ہوتی ہوئی موسیقی... اس ڈنر کے بعد عنایت حسین کو پروموشن ملا تھا اور انھوں نے پورا ایک مہینا یورپ میں گھوم پھر کر گزارا تھا۔

"کمپنی کی نوکری چھوڑی بھی تو نہیں جاسکتی،" نائلہ نے ایک گہرا سانس لیا اور سر پر ڈھلکتے ہوئے پلو کو مضبوطی سے سر پر جما لیا اور پھر بلند ہوتی ہوئی آواز کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی۔

"ہم اس پر قادر ہیں کہ انگلیوں کے پوروں تک کو درست کر دیں۔"

باورچی خانے سے ہنڈیا کے جلنے کی بو آرہی تھی اور نائلہ کی ساس دم سادھے بیٹھی تھیں۔ ابھی کوئی اور دن ہوتا تو وہ اس خوشبو پر باورچی اور اس کی سات پشتوں کو توم کر رکھ دیتیں۔ نائلہ کو الگ باتیں سناتیں جس نے اس کو سر پر چڑھا رکھا ہے۔ بچوں کو الگ جھاڑ پڑتی کہ نہ نماز نہ قرآن، ہے ہے کیسے بے نتھے بجار اٹھ رہے ہیں! اور پھر ان کو اگلی پچھلی ساری باتیں یاد آتیں۔ نماز کی چوکی پر بیٹھے بیٹھے ان کو دنیا جہاں کی فکریں آگھیرتیں۔ پر آج کے دن وہ ہر فکر کو الگ کر کے اور دل کو ایک طرف لگا کر بیٹھتی تھیں۔ اس دن کی عظمت ہی کچھ ایسی تھی۔ اس دن کتنے ہی پتھر موم بن جاتے تھے اور کتنے ہی مومی دل پگھل کر بہنے لگتے تھے۔

سناٹے میں پھیلتی ہوئی آواز۔ "کیا انسان، حشر و نشر کا منکر..." اس آواز سے چونک کو اختر علی نے فیصلہ کر لیا۔

"استعفیٰ دے دوں گا۔ قطعی استعفیٰ۔ سود اور سٹے کا دخل ہے۔ فرم کا سارا کاروبار ہی سٹے پر چلتا ہے۔ خدا کی قسم، ایمان پر آنچ آتی ہے۔ لعنت ہے ایسی روزی پر۔" اے طائر لاہوتی... وہ زمین پر بیٹھے بیٹھے پر پھڑپھڑا کر اونچے اونچے اڑنے لگے۔ ان کی اس اڑان میں کتنا ہلکا پن تھا۔ ایک شان استغنا۔ "نان جویں کھا کر جی لیں گے، کیوں؟" انھوں نے سوالیہ نظروں سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا۔ بیوی کے چہرے پر چھائے ہوئے سکوت کو دیکھ کر انھیں ڈھارس سی ہوئی۔ انھوں نے بالوں کو اچھی طرح ڈھانپ لیا۔

"یہ روز روز کی پارٹیوں نے اور قہر ڈھایا ہے،" وہ سر ڈھانپتے ہوئے بڑبڑائیں۔

مستقل خضاب لگا لگا کر انھیں مستقل نزلہ رہنے لگا تھا۔ پر لگانا بھی ضروری تھا۔ عمر کا بھید اگر کسی پر کھل گیا تو ساری مارکیٹ ویلیو ختم۔

"کاش خلافتِ راشدہ کا دور واپس آ سکتا۔ اے بی بی فاطمہ اور اے حضرت عائشہ، اے گھروں کی چہار دیواری میں پلنے والی عالی مرتبت بیبیو۔ وقت اگر پیچھے کی طرف پلٹ سکتا..." اختر علی کی بیوی عارفہ نے جھلا کر سوچا۔ وقت کا ساتھ دیتے دیتے وہ ہر وقت بولائی ہوئی سی رہتی تھیں اور کسی معجزے کی منتظر تھیں۔ انھوں نے اپنے چست اور کسے ہوئے لباس سے عاجز آ کر خدا کی جناب میں گردن جھکا لی اور ان آیات کا مفہوم سمجھنے لگیں جو کمرے کی خاموشی کو چیرتی ہوئی ان کی طرف بڑھ رہی تھیں۔

ان کی چاروں لڑکیاں جوان تھیں۔ فرزانہ نے ابھی دو مہینے ہوئے موسیقی کی کلاس میں داخلہ لیا تھا۔ بارمونیم پر وہ داغ کی مشہور غزل بالکل فریدہ خانم کے انداز میں گانے لگی تھی۔

ناروا کہیے ناسزا کہیے

کلب کے سالانہ ڈنر پر اس نے یہ غزل گائی تھی اور جب ہی سے پیغام پر پیغام آ رہے تھے۔ لڑکوں کی ایک طویل فہرست تھی۔ اختر علی اور عارفہ کو فرصت سے گھر پر بیٹھنے کو ملے تو انتخاب کریں۔ پھر فرزانہ کی پسند ـــ لڑکا کم از کم سگریٹ تو ضرور پیتا ہو۔

"اے خدا!" عارفہ نے عقیدت سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

چار جوان لڑکیاں! شادی کے بازار میں ان کی قیمت بڑھانے کے لیے کیا کچھ نہیں کرنا پڑ رہا ہے، جب کہ صورت شکل بھی واجبی سی ہے۔ دھندلے دھندلے رنگ جو میک اپ اور بجلی کی روشنی میں تو چل سکتے ہیں لیکن دن کے اجالے میں؟ فرزانہ نے غزل برقی روشنیوں کے اُمڈتے ہوئے سیلاب میں گائی تھی۔ اس کے چہرے پر رنگوں کا جال سا پھیلا ہوا تھا اور رنگوں کی اس گنجلک میں اس کا اپنا رنگ کہیں کھو گیا تھا اور اس وقت عارفہ نے اطمینان کا سانس لیا تھا۔ رات کی سیاہی اور مصنوعی روشنیوں نے ایک بہت بڑی حقیقت پر پردہ ڈال دیا تھا۔ حقیقتوں کے اظہار کا یہ دور ہے بھی کب؟ اختر علی کی چاروں لڑکیاں جوان تھیں۔ فرزانہ نے اچھا گلا پایا تھا۔ نازک انگلیاں ستار کے تاروں کو ہی نہیں چھیڑتی تھیں بلکہ دل کے تار بھی جھنجھنا اٹھتے تھے۔ سالانہ ڈنر پر انسانوں اور

روشنیوں کے بہتے ہوئے سیلاب میں وہ گا رہی تھی:

کیسے کیسے مجھے برا کیسے

تب جاوید علی پچھلی نشست سے چھلانگ لگا کر آگے آگیا تھا اور سینے پر ہاتھ مار کر کہا تھا:

"کیا کہیے!" داد اور تحسین کے نعروں میں ملے جلے مترنم قہقہے۔ اختر علی کا سینہ فخر سے پھیل گیا تھا اور عارفہ کو اپنی چاروں لڑکیوں کے مستقبل کی طرف سے جو اندیشے گھیرے رہتے تھے وہ لمحے بھر کو دور ہو گئے تھے۔ فرزانہ گا رہی تھی۔ اس کی آواز میں سوز بھی تھا اور جھنکار بھی۔ دل ڈوبتے تھے اور پھر اچھلنے لگتے تھے۔ سامعین آواز کے جادو پر سر دھن رہے تھے اور عارفہ اور اختر علی کے چہروں پر پھیلی ہوئی فکر کی پرچھائیاں پھیل پھیل کر اندھیرے میں ڈوبتی جا رہی تھیں۔

ناہید کے جسم میں بلا کا لوچ تھا۔ رقص کی تعلیم اس نے اپنے شوق سے حاصل کی تھی۔ آج کل وہ مغربی دھنوں پر پھرکنی کی طرح چکر پھیریاں کھا کھا کر اپنے ملنے جلنے والوں پر اثر ڈال رہی تھی۔ عالیہ گلیمر کی دلدادہ تھی۔ بھڑک دار کپڑے اور پارٹیاں، ہوٹل اور پکنک۔ اس کا کوئی لمحہ خالی نہیں گزرتا تھا۔ عارفہ اور اختر علی کو اس کی طرف سے اطمینان تھا۔ وہ مستقبل قریب میں اپنی پسند کا اعلان کرنے والی تھی۔ اس کی پسند بھی انوکھی تھی۔ لڑکا نہیں مرد۔ وہ اونچی ایڑی والی جوتیوں پر پورا گھوم کر یہ بات کئی مرتبہ عارفہ اور اختر علی کو بتا چکی تھی۔ پھر ان کے حیران چہرے کو دیکھ کر ہنستی اور کہتی، "مما. فکر نہ کریں، انتظام پکا ہے۔" اختر علی اور عارفہ اس کی طرف سے مطمئن تھے اور اس کے اعلان کے منتظر تھے۔ شبنم سمندری مچھلی تھی۔ اپنے اس شوق کی تکمیل کے لیے وہ باہر جانے کے لیے ہاتھ پیر مار رہی تھی۔ وقت لگامیں توڑ کر سرپٹ دوڑ رہا تھا۔ اختر علی کی چاروں لڑکیاں کوشش کے باوجود اس کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پا رہی تھیں۔

"کس قدر پھسڈی ہیں ہم لوگ!" اختر علی نے آواز کی لہروں سے اُبھر کر سوچا۔ آواز برابر ان کے کان کے پاس آ آ کر ٹکرا رہی تھی اور ان کا دل اندر اندر بیٹھتا جا رہا تھا۔

"اس وقت میرے اختیار میں کچھ نہیں،" انھوں نے بے بسی سے اپنی گردن ایک طرف کو ڈال دی۔ آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ آہستہ پھیلتی ہوئی آواز کو اپنے اندر جذب کرنے لگے۔ دن کی عظمت پورے جلال کے ساتھ ان پر اثر کر رہی تھی۔ ان کے سامنے نہ دنیا تھی اور نہ دنیا کی

رنگینیاں، نہ درآمد برآمد کا کاروبار، نہ کھانڈوالا کی فرم، نہ عریاں رقص اور نہ ستار کے تاروں کو چھیڑتی ہوئی پتلی پتلی انگلیاں اور نہ فضا کو مسحور کرنے والی فرزانہ کی بہتی ہوئی آواز۔ اس وقت ان کے کان میں بس ایک آواز آرہی تھی۔

"پھر اس کے بعد تمہارے دل سخت ہو گئے..." آنسو اختر علی کی آنکھوں سے بہنے لگے۔ ان کے بائیں ہاتھ پر بیٹھی ہوئی طاہرہ کی آنکھوں میں خوف کی پرچھائیاں کانپیں اور انھوں نے سوچا:

"گھر میں بیٹھنا چاہیے۔" وہ تقریباً تین سال سے بحیثیت اسٹینوگرافر کام کر رہی تھیں اور تین سال سے برابر استعفیٰ دینے کا سوچتی رہتی تھیں۔ حالات نے ان کو گھر سے اٹھا کر سڑک پر لا کھڑا کیا تھا۔ وہ سوچتی تھیں:

"بچے ترقی کی دوڑ میں سب سے پیچھے رہ جائیں گے۔ لعنت ہے اردو سکولوں پر۔ انگریزی اسکولوں کی فیس! کم بخت لٹیرے... ترکاری کے بھاؤ۔ سولہ روپے کلو بھنڈی۔ کپڑے دھونے کا صابن...! خدارا یہ مہنگائی۔ مجھے نوکری کر ہی لینی چاہیے۔"

انھوں نے یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ استعفیٰ دینے کا خیال انھیں ابھی ابھی آیا تھا۔ کمرے میں پھیلی ہوئی آواز آہستہ آہستہ دل کی گہرائیوں میں اتر رہی تھی اور اس آواز کا سہارا لے کر وہ اپنا مقام متعین کر رہی تھیں۔ ذہن آواز کے ساتھ ساتھ گھوم رہا تھا اور اس بوکھلاہٹ میں وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھیں۔ انھوں نے بےچارگی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر سب کو محو دیکھ کر اپنا آدھا کھلا ہوا سر ڈھانپ لیا اور کچھ اور زیادہ انہماک سے بلند ہوتی ہوئی آواز کو سننے لگیں۔ کونے میں بیٹھے ہوئے امجد حسین نے محسوس کیا جیسے ریس کے میدان میں گھوڑے دوڑتے دوڑتے چاروں شانے چت گر پڑے ہوں۔ "سرکاری نوکری اور وہ بھی ایمان داری سے۔ آدھی درجن بچے، بوڑھے ماں باپ اور جوان اور شوقین مزاج بیوی۔ ریس کے گھوڑے نہ دوڑائیں تو کیا کریں؟" امجد حسین نے کانوں کے قریب آتی ہوئی آواز کو نظر انداز کر کے سوچا۔

"آٹھ ہزار تنخواہ اور بیس ہزار روپیہ ماہانہ خرچ۔ حالات مجھے ڈھکیلتے ہوئے ریس کورس لے جاتے ہیں۔ میں حالات سے مجبور ہوں۔ اے خداوند! مجھے تیری عظمت سے مطلق انکار نہیں۔ مجھے

ان قرآنی آیات سے بھی انکار نہیں جو اس دن کو جلال اور جمال بخشتی ہیں۔ میں دن کی عظمت کا بھی احترام کرتا ہوں۔ اس دن کا جو ہفتے میں ایک بار آتا ہے۔ ہم سب اس دن کی عظمت کا احترام کرتے ہیں جب مونالیزا کا فریم دیوار پر الٹا لٹکا دیا جاتا ہے۔ جب گوتم کے مجسمے پر کپڑا ڈال دیا جاتا ہے۔ جب ایفل ٹاور، مومی مجسمے، ننگی اور عریاں تصویریں، مچھلی کا سر، بھوسا بھرا ہوا ہرن اور بنگال کی طرح دار حسینائیں سب دبک سمٹ کر کونوں میں دبک جاتی ہیں اور کمرے میں ایک گھنا اور گہرا سناٹا پھیل جاتا ہے اور ایک وزنی آواز کمرے میں پھیلتی ہے اور کمرے میں بیٹھے ہوئے ہر فرد کے کانوں سے ٹکرا کر دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔ دل خوف سے کانپتے ہیں اور انسان اپنی ہیئت بدلنا شروع کر دیتے ہیں جیسے وہ گوشت پوست کے انسان نہ ہوں، پتھر کے بت ہوں، لات و منات ہوں، ہبل اور عزیٰ ہوں۔ وقت ان کے چہروں پر نقابیں ڈال دیتا ہے اور اس طرح یہ عظمت اور جلال والا دن ختم ہوتا ہے جس کی عظمت کے ہم سب قائل ہیں۔" امجد حسین نے پھڑپھڑاتی آنکھوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ کمرہ خالی تھا۔ وہ سب اٹھ کر جا چکے تھے۔ امجد حسین بھی دروازے سے باہر نکل گئے۔

اور پھر دوسرے دن ـــ ہفتے کے بقیہ چھ دن ـــ ڈرائنگ روم کو پھر ترتیب دیا جاتا۔ مونالیزا کی مسکراہٹ پھر پورے کمرے میں بکھر جاتی۔ اس کے سینے کا ابھار پھر دلوں میں گدگدیاں پیدا کرنے لگتا۔ گوتم کی مورتی پھر آنکھیں بند کر کے آتش دان پر بیٹھ جاتی۔ کانسی، پتھر اور موم کے مجسمے سب جم کر کھڑے ہو جاتے۔ نسوانی حسن اور قدرتی مناظر پھر دلوں کو گرمانے لگتے اور نائلہ شام کو ہونے والی پارٹی کے انتظام میں مصروف ہو جاتیں۔

پائے دُزد کی چاپ

ماں کے گھر بھی پھپھولا رانی بنی رہی؛ ساس کے گھر بھی بتاشوں پر چلتی ہوئی آئی۔

شادی والے دن جب اس کے پیروں کو دودھ سے دھلوایا گیا تو نعیمہ بیگم حیران رہ گئیں۔ بالکل دودھ کے رنگ کے پیر۔ چہرہ دیکھا تو اور بھی حیرت ہوئی۔ عذرا کے متعلق جیسا سنا تھا اس سے ہزار گنا بہتر پایا۔ پیروں پر سے نظریں ہٹائیں تو کنول جیسے ہاتھوں پر اٹک گئیں۔ انگلیوں پر نظر پڑی تو محسوس ہوا سورج نکلنے والا ہے۔ آنکھوں کو دیکھا تو نیند سی آنے لگی اور پلکوں پر نظر پڑی تو دم حلق میں اٹکتا ہوا محسوس ہوا۔ پھر نپا تلا قدم، بھرا بھرا جسم اور عمر کا سولھواں سال۔ نعیمہ خاتون عورت ہو کر بھی خود کو بھولنے سی لگیں۔ عذرا کو کمرے میں پہنچا کر وہ اپنے پلنگ پر آ کر لیٹ گئیں۔ تمام رات طرح طرح کے خیالات ان کو پریشان کرتے رہے۔

سفید سفید پیر، سورج کی کرنوں سے ملتی جلتی انگلیاں، کنول جیسے ہاتھ پلکوں کی جھالر اور لوری دیتی ہوئی آنکھیں۔ ان کی آنکھوں سے نیند غائب ہو گئی اور آنکھیں بند کمرے کے دروازے پر جا کر اٹک گئیں اور ذہن بچپن کی کہانیاں دہرانے لگا۔

"بڑے خوفناک دیو، نازک شہزادیوں کو قید کر کے ناکوں چنے چبواتے تھے اور پھر اپنے غصے کے طوفان میں، جو تمام تر آگ اور دھویں سے پر ہوتے تھے، انھیں بھسم کر دیا کرتے تھے۔

ان کا بیٹا رضوان دیو ہی تھا۔ چھ فٹ تین انچ قد اور سینہ دائیں بائیں بس پھیلتا ہی جاتا تھا۔ اس کی چوڑائی ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ کشادہ شانے اور چوڑی چھاتی لیے جب وہ گھر میں

داخل ہوتا نعیمہ بیگم خود نگاہیں چرا جاتیں۔ ان کو خود بھی شک ہونے لگتا تھا کہ رضوان ان کا ہی بیٹا ہے۔ کوئی اور ماں ہوتی تو فخر سے پھولا نہ سماتی، پر نعیمہ بیگم کو اس کو دیکھ کر گھبراہٹ ہونے لگتی۔ وہ اپنے پلنگ پر بے چین اور آنکھیں کھولے پڑی تھیں اور سوچ رہی تھیں:

"عذرا ڈر نہ جائے۔ ماں نے اسے بالکل ہی پھپھولا رانی بنا کر رکھا ہے۔" رخصت کرتے ہوئے عذرا کی ماں کے الفاظ ان کے ذہن میں گھوم رہے تھے۔

"میں نے اسے ہاتھوں چھاؤں رکھا ہے۔ چینی کی گڑیا تمہارے حوالے کر رہی ہوں۔ دل کہاں پانی کا بلبلہ ہے اس کے سینے میں۔ ذرا سی ٹھیس لگی اور ٹوٹا۔ ذرا خیال رکھنا۔ اور ہاں رضوان احمد کو بھی سمجھا دینا، بس ذرا دھیان رکھیں۔"

رات کے اندھیرے میں ہزاروں رنگ بکھرے ہوئے تھے۔ پلنگ پر عذرا عروسی کپڑوں میں منڈکری مارے بیٹھی تھی۔ وہ رضوان کے ہاتھ لگانے سے ہی پوری کی پوری کانپ اٹھی تھی۔ خوف نے اس کے چہرے کو بالکل جھلسا دیا تھا اور وہ روئے جاتی تھی۔ رضوان نے اس کے اوپر وزنی کمبل ڈال کر بالکل ننھے بچوں کی طرح اس کو تھپک تھپک کر سلا دیا تھا۔ کمبل کے اندر خوف سے کانپتا ہوا عذرا کا جسم کمرے کی دھندلی روشنی میں دیوار پر عجیب وغریب پرچھائیاں بنا رہا تھا، جیسے کمرے کی ہر چیز گتھم گتھا ہو۔ دیوار پر پھیلی ہوئی ان بےڈھنگی پرچھائیوں کو دیکھ کر رضوان کے پورے جسم میں کوئی چیز بہنے سی لگی اور ایک مرتبہ پھر خواہشات نے اس کے دل میں گدگدی سی پیدا کی۔ اس نے عذرا کے کمبل کا کونا سرکایا ہی تھا کہ وہ چھلانگ لگا کر دور جا کھڑی ہوئی اور رضوان حیران رہ گیا۔ ڈھیلے ڈھیلے رات کے باریک لباس میں سمٹا ہوا اور کانپتا ہوا عذرا کا سراپا دیوار میں جڑا ہوا زور زور سے ہل رہا تھا۔

رضوان مرد تھا۔ پوری دنیا گھومے ہوئے تھا۔ ہر طرح کی عورتوں سے اس کا واسطہ پڑا تھا۔ دراز قد، کشادہ شانے اور خوبصورت خدوخال والے اس نوجوان میں جنس مخالف کے لیے بےپناہ کشش تھی۔

ایک غیر ملکی بوڑھی عورت نے ایک مرتبہ اس کو تیراکی کے مخصوص لباس میں دیکھ کر کہا بھی تھا:

"تمھارا یہ خوب صورت جسم! تم اب تک کنوارے ہو؟"

نعیمہ بیگم نے بہت سمجھا بجھا کر رضوان کو شادی پر تیار کیا تھا۔ وہ بہت مشکل سے قابو میں آیا تھا۔ نوکری کے سلسلے میں اس کو ہر وقت بیرون ملک جانا رہتا تھا۔ نعیمہ خاتون پورا وقت فکروں میں گزارتی تھیں۔

"الٰہی شیطان طوفان سے بچائیو۔ وہاں کی عورتیں تو جادوگرنیاں ہوتی ہیں۔" ان کو وقت گزارنا مشکل ہو جاتا تھا اور پھر جب رضوان کسی غیر ملکی دورے سے بغیر "میم" لیے واپس آتا تو ان کا پیر زمین پر نہیں ٹکتا تھا۔ سجدے میں پڑے پڑے ان کا ماتھا چٹخ اٹھتا۔ شکرانے کے نفل پڑھ پڑھ کر گھٹنے سوج جاتے۔ صدقے کے بکرے ذبح ہوتے اور اسی "مِٹی میم" پر خوب تبرّا بھیجا جاتا جس کا ذکر رضوان محض نعیمہ بیگم کو چڑانے کے لیے یوں ہی مزہ لے لے کر کرتا۔

"اے یہ بات نہیں، گھاٹ گھاٹ کا پانی پیے ہوئے ہے۔"

"صورت تو دیکھو۔ بوڑھا گھاگ! کیسا خرانٹ پن ہے چہرے پر۔ بھولی ماں کو خوب چٹکیوں میں اڑاتا ہے۔ جانے کیا کیا گل کھلاتا ہوگا۔" دوسری کہتی: "کوئی بات ہی ہوگی، جب ہی تو اب تک کوئی عورت نہیں جڑی۔ بیسیوں ملک چھان ڈالے مگر ہر جگہ سے یوں ہی ڈنڈا سی پونچھ بڑنگا سا رستہ کرتے چلے آئے۔"

رضوان کے کانوں میں بھی یہ سرگوشیاں پڑتی تھیں۔ اس کا دل چاہتا وہ ابھی اڑ کر جائے اور ان تمام عورتوں کو اٹھا لائے جن کے ساتھ اس نے غیر ملکی راتیں، دھند اور کہر میں چھپی ہوئی دھیمے دھیمے گزرنے والی راتیں گزاری ہیں۔ اس کو عورتوں کی کیا کمی۔ وہ وہاں سے بیسیوں عورتیں لا سکتا تھا۔ پر بھاڑ دروازے کی طرح کھلی ہوئی عورتیں اسے پسند نہیں تھیں۔ جب کبھی بھی نعیمہ بیگم نے اس کی پسند پوچھی اس کا ایک ہی جواب تھا:

"امی کوئی ڈھکی چھپی لڑکی تلاش کریں۔"

عذرا کے سمٹاؤ میں بڑی دلکشی تھی۔ شروع شروع میں رضوان کو عذرا کا ہاتھ لگانے سے سہم جانا، پاس بیٹھنے سے سکڑ جانا اور سانس کی گرمی سے کانپ اٹھنا بڑا اچھا لگا۔ عذرا سمٹتی رہی اور رضوان پھیلتا رہا۔ اس سمٹاؤ اور پھیلاؤ کے درمیان جو پہلے دن سے ایک وسیع خلا پیدا ہو رہا تھا وہ پہلے

ہی دن سے نعیمہ بیگم کو دہلانے لگا تھا۔ دن کی روشنی میں انھوں نے بہو بیٹے کی شکلیں دیکھیں اور دھک سے رہ گئیں۔

"نہ نور نہ صبور! وہ چہرے کی چاشنی کہاں۔ اوں ہنہ، شادی والی بات ہی چہرے پر نہیں!"

ان کی بے چین نگاہیں اٹھتے بیٹھتے عذرا کے جسم کو ٹٹولتی رہتیں۔ ان کا دل چاہتا، وہ عذرا سے پوچھیں۔ کچھ دنوں کا حساب کتاب دریافت کریں: "کے دن چڑھے، کے دن اترے۔" پھر ان کو اپنے پاگل پن پر خود ہی ہنسی آجاتی۔

"اے لو! ابھی پوری طور سے عذرا کو دیکھا ہی کب تھا۔ وہ اس کو ہاتھ ہی کب لگانے دیتی تھی۔ جوں ہی وہ قریب گیا اور اس کو مرگی کا سا دورا پڑا۔ رضوان سر پکڑ کر رہ جاتا۔ وہ ہر طرح سے عذرا کو بہلاتا، چمکارتا، تسلّی دیتا، بعض اوقات جھڑکتا اور جھلّاتا، پر سب بے سود۔ عذرا کا خوب صورت اور تنا ہوا جسم مروڑیاں سی کھا کر بے جان ہو کر رہ جاتا۔ آنکھوں میں وحشتیں بھر جاتیں اور وہ رحم اور التجا بھری نظروں سے رضوان کو دیکھتی تو رضوان بھی کانپ اٹھتا۔ سارے جذبات آناًفاناً ختم ہو جاتے۔ وہ اپنی آواز میں ماں کا دلار اور باپ کا پیار بھر کر عذرا سے کہتا:

"سو جاؤ۔ میں کچھ نہیں کہتا۔ سو جاؤ۔" عذرا بے یقینی کے انداز میں آنکھیں پھاڑے اس کو دیکھتی رہتی اور جب اس کو یقین ہو جاتا کہ رضوان دور پلنگ پر لیٹ کر سو گیا ہے تو وہ بھی آنکھیں بند کر کے لیٹ جاتی۔ وہ جوں ہی سونے کا ارادہ کرتی اس کے حواسوں پر چھایا ہوا خوف اس کا گلا دبوچنے لگتا۔ اس کی اپنی جمیلہ خاتون کا چہرہ اندھیرے میں پھیلتا اور کپکپاتے ہوئے ہونٹ عذرا کو بہت سی باتیں کہتے ہوئے محسوس ہوتے۔

"پیٹ رہ جاتے ہیں!"

"منہ پر پھٹکار برسنے لگتی ہے!"

"جسم لبیرے کی طرح لٹک جاتا ہے!"

"عورت مرد کا ملاپ شیطان کا ملاپ ہے!"

جمیلہ بیگم نے بڑھتی عمر کے ساتھ ساتھ عذرا کو سب اونچ نیچ سمجھا دی تھی۔

اس کے جسم میں تھوڑی بہت تبدیلیاں ہی پیدا ہوئی تھیں اور دبلے پتلے جسم نے بھرنا اور

پھیلنا شروع کیا تھا کہ وہ اس کو دبوچ کر بیٹھ گئیں۔ ایک لمحے کے لیے بھی وہ اس کو اپنے سے الگ نہیں کرتی تھیں۔ وہ روٹی پکا رہی ہیں تو عذرا سامنے بیٹھی ہوئی ہے۔ آٹے کو بل دیتے ہوئے، پیڑا بناتے ہوئے اور روٹی بیلتے ہوئے بار بار اس کے چہرے کو دیکھتی تھیں۔ روٹی توے پر پڑتی، گرمی پا کر پھولتی۔ پھولی ہوئی روٹی دیکھ کر عذرا کا دل چاہتا کہ وہ تالیاں بجا بجا کر ناچنا شروع کر دے کہ اس کی ماں جمیلہ بیگم بول پڑتیں:

"عورت بھی یوں ہی ایک دن غبارے کی طرح پھول جاتی ہے۔"

عذرا کی آنکھوں میں بہت سی حیرانیاں بھر جاتیں۔ وہ اپنے جسم پر نظر ڈالتی۔ رات کو سوتے وقت وہ اپنی ماں کے ساتھ سمٹ کر لیٹ جاتی۔ ماں خوف سے کانپتی ہوئی عذرا کو اپنے ساتھ لگا لیتی۔ اس طرح اپنی ماں کے ساتھ لیٹنے میں اس کو بڑا سکون ملتا۔ ڈر، خوف اور حیرت سے تنے ہوئے اس کے اعضا آہستہ آہستہ کھلنے لگتے۔ ایک لذت ایک کیف اور نشہ سا اس کے احساسات پر چھانے لگتا۔ اس کو محسوس ہوتا کہ اس کے برابر پلنگ پر لیٹی ہوئی اس کی ماں نہیں بلکہ وہ تو وہ موٹا لکڑ ہے جو بھڑ بھڑ کر کے جل رہا ہے اور جو ابھی عذرا کو روٹی کی طرح پھلا کر رکھ دے گا۔ اس خیال سے ہی اس کو وحشت ہوتی اور وہ بڑبڑا کر اٹھ بیٹھتی۔

عذرا بہت تیزی سے بڑی ہو رہی تھی جیسے وہ ایک دم سے پھٹ جانا چاہتی ہو۔ جمیلہ خاتون کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرف سے اس کو روکیں۔ سینے کا ابھار، کولھوں کی گولائی، کمر کا کٹاؤ، گردن کا خم، قد کی اُٹھان اور چہرے کی دلکشی۔ جس چیز کو وہ چھپانے کی کوشش کرتیں وہ ہی پھٹ پڑنے کو تیار۔ اوپر سے محلّے کا گھر۔ اچھے برے لوگوں کا ساتھ۔ وہ کس کس کو روکتیں۔

"مرد کی ذات بڑی بدذات ہے،" وہ عذرا کو سمجھاتیں۔

"عورت مرد کا ملاپ شیطان کا ملاپ ہے۔ خبردار جو کبھی کسی سے سیدھے منھ بات کی۔"

عذرا عمر کے اس موڑ پر تھی کہ کسی نے بات کی اور وہ پانی کی طرح بہی۔ کٹاؤدار بل کھاتا ہوا اس کا جسم لہریں سی لیتا ہوا جس طرف سے بھی گزرتا مرد تو مرد عورتوں کے دل بھی مچل اٹھتے تھے۔

اور جب نعیمہ بیگم عذرا کو بیاہ کر اپنے گھر لائیں تو وہ بھی بہت خوش تھیں۔

"میاں ساری چوکڑی بھول جائیں گے۔ سمندر پار کی ساری روشنیاں ماند پڑ جائیں گی۔"

عذرا سینکڑوں اندیشے لے کر ان کے گھر آئی تھی۔ مرد کا "ہوّا" جس سے بچپن سے لے کر اب تک اس کو ڈرایا گیا تھا اس کے حواسوں پر سوار تھا اور اندھیرے کمرے میں اس نے نظریں گھما گھما کر دیکھا۔ رضوان اس کو ہی دیکھ رہا تھا اور جب ہی اس پر لرزہ طاری ہو گیا۔ پوری رات اس نے کانپ کر اور ڈر کر گزاری۔ رضوان کے پلنگ کو تکتے ہوئے جانے کب اس کی آنکھ میں نیند آ گئی اور صبح کو جب وہ اٹھی تو رضوان آفس کے لیے جا چکا تھا۔

ایک رات گزری اور دوسری رات آئی۔ عذرا کے دل پر جو دہشت چھائی ہوئی تھی وہ بدستور قائم تھی۔ رضوان کے قدموں کی بھاری چاپ کے ساتھ اس کا دل دھکڑ پکڑ کرنے لگتا اور جوں جوں وہ آواز قریب آتی جاتی عذرا بے حال ہو کر کانپنے لگتی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر رضوان دم بخود ہو جاتا۔

"کیا بلا سر پڑی!" وہ جھنجھلا کر سوچتا۔ اس مختصر سی مدّت میں وہ ہر ہتھکنڈا آزما چکا تھا پر عذرا کے پاگل پن میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ رضوان کو غصہ آتا۔ پھر اس کی شکل اور معصومیت پر ترس کھا کر وہ اس کو سونے کی ہدایت کر کے اپنے بستر پر آ پڑتا۔ ناکام راتوں نے اس کو اعصاب کو تھکا دیا تھا۔ دن بھر اس پر جھلاہٹ طاری رہتی۔ ادھر نعیمہ بیگم دن گزرنے کے ساتھ ساتھ عذرا کو ٹٹولنے لگی تھیں۔ فکرمند اور سوچتی ہوئی نعیمہ بیگم جب بھی عذرا کو دیکھتیں وہ گھبرا جاتی۔ ایک نامعلوم جرم کا احساس اس کے پورے چہرے پر پھیل جاتا۔ وہ آنکھیں پھاڑ کر ان کو دیکھتی۔ ان کے ہونٹوں سے نکلنے والے الفاظ سمجھنے کی کوشش کرتی۔ پھیلتی دھوپ میں پلنگ پر پڑے پڑے وہ سارا سارا دن بذیان سا بکتی رہتی تھیں۔

"بی بی یہ تو وہ بھٹی ہے جس کی آنچ ایک مرتبہ سہار لو، پھر دیکھو کیا جوبن اور کیا نکھار!"

"مرد سر کا تاج ہے۔ بے تاج کی ملکہ کون قبولے ہے۔"

"رضوان کے ابا! کیا کاٹھی تھی اور کیا جوانی! مجھے تو ایک ہاتھ سے اُٹھا لیویں تھے۔ گھر میں آتے تو کونے بچالے ہی تلاش کرتے پھرتے تھے۔ جہاں نظر بچی اور کر گزرے اپنی سی۔ یہ وہی چاہت تو ہے۔ وہی لگاوٹ۔ عورت تو مٹی کا تودا ہے۔ زمین کی خاک۔ مرد نے منہ لگایا تو سمجھو آسمان پر پہنچ گئی۔ نہ لگایا تو ذلیل و خوار۔"

عذرا دن بھر الجھا کرتی۔ بچپن سے جوانی تک اس نے ایک سبق پڑھا تھا۔ مرد کو اس کے

احساسات پر بھوت کی طرح سوار کر کے اس کی ماں ہر طرف سے مطمئن ہو بیٹھی تھی اور اب اس کی ساس اسی مرد کا ذکر ایسے چٹخارے لے لے کر کرتی جانو کوئی کھٹی میٹھی گولی چوس رہی ہو۔ وہ مرد کا جو نقشہ کھینچتی تھیں اس میں ایسی لذت اور ایسا سرور تھا کہ عذرا کا دل چاہتا وہ اس جھولنے میں پڑی رات دن جھولتی رہے۔ تب اس کا دل چاہتا کہ گھر کا دروازہ کھلے، رضوان آئے اور پھیلے ہوئے صحن، پیچ دار دالان اور اندھیرے کمروں میں دوڑ دوڑ کر کونے بچالے تلاش کرنے شروع کر دے اور پھر اس کو اس آسمان کی سیرا کرائے جس کا ذکر نعیمہ بیگم ہر وقت کرتی رہتی تھیں۔

"تب پھر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جسم نہ ہو ہلکی پتیوں والا پھول ہو۔ آنکھوں کے سامنے ایک وسیع اور طویل آسمان پھیل جاتا ہے۔ جس پر ستارے رنگ رنگ کا لباس پہنے چھلیں کرتے ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ آنکھوں میں رنگ بھر جاتے ہیں اور خوشی کے بلبلے سینے میں بننے اور بھٹنے لگتے ہیں۔ عورت اپنا آپ بھول جاتی ہے۔ شیشے میں منہ دیکھتی ہے تو خود کو پہچان نہیں پاتی۔ اپنی سج دھج پر خود حیران ہوتی ہے اور پھر خود شرما جاتی ہے۔"

نعیمہ بیگم کی باتیں سن کر عذرا کے پورے جسم میں کوئی چیز آہستہ آہستہ بہنے لگتی۔ اکیلا ڈھنڈار کمرہ اس کو کاٹنے کو دوڑتا۔ اس کا دل چاہتا رضوان آئے، پر عذرا اس وقت کے تصور سے ہی کانپ جاتی جب رضوان کمرے میں قدم رکھتا، اپنے بڑھتے ہاتھوں کو روکتا اور لڑکھڑاتے قدموں پر قابو پاتا ہوا اس سے کافی فاصلے پر جا کر بیٹھ جاتا اور پھر اپنی بھاری آواز سے اس کو تھپکیاں دے کر سلا دیتا تھا۔ رات کو اندھیرے میں کبھی عذرا کی آنکھ کھلتی تو وہ رضوان کے پلنگ کی طرف دیکھتی۔ پلنگ پر پھیلی ہوئی رضائی منجمد اور ساکت سی پڑی رہتی۔ عذرا مطمئن ہو کر آنکھیں بند کر لیتی۔

اب کچھ دن سے عذرا کو رضوان کی یہ دوری کھلنے لگتی تھی۔ نعیمہ بیگم کی باتوں نے اس کے جسم کے ٹھٹھراؤ میں ایک قسم کی گرمی سی پیدا کر دی تھی۔ سوئی ہوئی مردہ خواہشات لاوے کی طرح بہہ نکلی تھیں۔ ذہن پر چھایا ہوا مرد کا ہیولا اب کسی ہلکی پھلکی کشتی کی طرح اس کے احساسات پر ڈولتا رہتا۔ وہ پہروں آنکھیں بند کر کے گزار دیتی۔ رات آتی اور وہ ہزاروں کہانیوں کو اپنے سینے سے لگائے کمرے میں داخل ہوتی۔ سپاٹ رینگتی ہوئی رات گزر جاتی اور بھاری پتھریلا دن نکل

آتا- نعیمہ بیگم پلنگ کو دھوپ کے رخ پر ڈال کر پھر بذیان سا بکنے لگتیں- عذرا کا دل چاہتا وہ اپنے گلے کی پوری نسیں پھلا کر رضوان کو پکارے- رضوان صبح سویرے ہی گھر سے نکل جاتا تھا- اور رات کو گھر آتا تھا- عذرا کو جاگتا ہوا پا کر اس کو سو جانے کی ہدایت کرتا اور پھر بے تعلق سا پلنگ پر گر پڑتا- عذرا کا دل مچل اٹھتا- وہ اس کے قریب جانے کا ارادہ کرتی، پھر سہم کر پیچھے ہٹ جاتی- کچھ کہنے کے لیے منہ کھولتی تو آواز حلق کے اندر پھنس جاتی اور وہ سرد اور تنہا بستر پر پڑے پڑے اونگھ جاتی-

سپاٹ گزرتے رات دن میں وہ بہت دفعہ رضوان تک جا کر واپس آ گئی تھی- کبھی تصور میں اور کبھی سچ مچ چلتی ہوئی اس تک آئی تھی پھر خود بخود پیچھے ہٹ گئی تھی- اس کے وزنی قدم تھوڑی دور چل کر زمین پر جم جاتے- ذہن میں دبی ہوئی آوازیں سرگوشیاں کرتیں- ماں اور ساس زندگی کے مختلف موڑ پر کھڑی لال ہری جھنڈیاں لہرایا کرتیں- کبھی لال جھنڈی فضا میں لہراتی اور کبھی ہری- گاڑی چلتی اور کبھی چلتے ہوئے ایک جھٹکے کے ساتھ رک جاتی- عذرا پلنگ پر لیٹے لیٹے لمبے لمبے سانس لیتی- کروٹیں لے کر کمرے میں پھیلے ہوئے سناٹے کو توڑنے کی کوشش کرتی- کبھی کراہتی اور کبھی خود ہی خود بولتی اور کبھی رضوان کی پتھریلی نیند کو کوستی ہوئی خود بھی سو جاتی-

ایک پھیلی ہوئی رات میں وہ اپنے تمام حواس یکجا کر کے اٹھی- چلتی ہوئی رضوان کے پلنگ کے قریب گئی- اس کے تکیے پر ہاتھ رکھا- سرد بے جان اور گلگلا سا تکیہ- اس کے پلنگ کی پٹیوں پر ہاتھ پھیرا- سرد اور کھردری پٹیاں- وہ سہم کر دو قدم پیچھے ہٹ گئی-

رات بہہ رہی تھی- عذرا نے پھر پلنگ کی پٹی پر ہاتھ رکھے اور دوسرے ہی لمحے پلنگ پر پھیلی ہوئی رضائی میں ڈوب گئی- وسیع اور خنک رات لمحے بھر کو رکی اور پھر ہمیشہ کی طرح سٹ سے گزر گئی- عذرا نے پلنگ کو ٹٹولا- لمبے لمبے ہاتھ مار کر اس نے پورا پلنگ چھان مارا- خالی اور تنہا پلنگ سمندر کی طرح پُرسکون تھا- عذرا کے پورے جسم میں برف سی بھر گئی اور وہ بری طرح کانپ اٹھی-

گلی میں کتے بھونک رہے تھے اور باہر پتھریلی سڑک پر قدموں کی چاپ تھی- جیسے چور کے پاؤں-

گدھ

کمرے کے اندر گہری خاموشی تھی۔ اندھیرا بڑھ گیا تھا اور سب کھڑکیاں اور دروازے بند تھے۔ روشن دان کے راستے داخل ہوتی ہوئی مُردہ روشنی کی لکیریں دیوار پر بے ڈھنگی پرچھائیاں بنا رہی تھیں۔ یہ سب کسی متوقع لمحے کے منتظر تھے۔ لکڑبارے کے ان لڑکوں کی طرح جنھیں خزانے کا پتا چل گیا تھا اور جنھوں نے بوڑھے باپ کی آنکھیں بند ہوتے ہی زمین میں گڑے ہوئے خزانے کا کھوج لگانا شروع کر دیا تھا۔ خزانہ جو سالہاسال سے زمین میں دفن تھا اور جس کی چکاچوند کا اندازہ انھوں نے بوڑھے لکڑبارے کی بند ہوتی ہوئی آنکھوں کی چمک سے لگا لیا تھا۔ تینوں لڑکوں نے آنکھ سے ایک بھی آنسو گرائے بغیر لکڑبارے کے آخری سفر کی تیاری کی تھی کہ گریہ وزاری سے مردے کی روح کو تکلیف ہوتی۔

قبرستان سے واپسی پر دھندلکا چھا چکا تھا۔ دن بھر کا تھکاہارا ہوا دن کسی بوڑھے کی طرح ہانپ رہا تھا۔ کچھ گھروں میں چراغ جل چکے تھے اور کچھ میں جلائے جا رہے تھے۔ آسمان پر چند ستارے ٹمٹما رہے تھے۔ فضا میں لوبان اور کافور کی سوگوار سی خوشبو تھی اور پوری بستی پر سکوت طاری تھا۔

"یہ سب دروازے کھول دو،" بدرالدین نے کرب میں ڈوبی ہوئی آواز سے کہا۔

نرس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا اور ڈاکٹر نے کالا چرمی بیگ کھولا، سرنج ہاتھ میں تھاما، جھریوں بھرے سرد اور بے جان بازو میں داخل ہوتی ہوئی سوئی دور تک نظر آتی رہی۔ سیٹھ صاحب کے چہرے پر پھیلے ہوئے سائے اور گہرے ہو گئے۔ انھوں نے منھ بگاڑا گویا سوئی کے راستے داخل

ہوتی ہوئی ساری کڑوی کسیلی دوا ان کے منہ میں پہنچ گئی ہو۔ اس لمحے انھیں ابکائی آئی اور بے چینی بڑھ گئی۔

"ڈاکٹر، یہ سلفر ڈرگس اور طبیعت بگاڑ رہی ہیں۔ کوئی اور دوا دو۔ سکون اور نیند کی دوا۔ اس بے چینی کو دور کرنے کے لیے،" نرس نے پہلے ڈاکٹر کو اور پھر بدرالدین کو دیکھتے ہوئے کہا۔

بدرالدین کا شہر میں درآمد و برآمد کا بہت بڑا کاروبار تھا اور اس نے چند سال کے اندر اندر اتنا روپیہ جمع کر لیا تھا کہ لوگوں کا خیال تھا کہ وہ گرد و نواح کے تمام گاؤں خرید لے گا۔ اس کے پاس تین کاریں، دو کوٹھیاں اور چار السیشین کتے تھے اور اس کے کپڑے پیرس میں سلتے اور وہائٹ وے میں تین گھنٹے میں ارجنٹ ریٹ پر دھلتے تھے اور وہ اب اس وقت سفید بستر پر ایک سرد بے جان اکڑی ہوئی سوکھی کھپچی کی طرح پڑا تھا اور لمحہ بہ لمحہ بڑھتے ہوئے وقت سے زندگی کی بھیک مانگ رہا تھا۔ زندگی جو اس سے دور بھاگ رہی تھی۔ فضا گرد سے بوجھل بوجھل تھی۔ بدرالدین کی کلائی پر بندھی گھڑی گزرتے وقت کا اعلان کر رہی تھی۔ انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی کانپ رہی تھی۔ میز پر عین درمیان میں رکھا ہوا سنہری فریم کا چشمہ کمرے کی نیم مردہ روشنی میں بار بار چمک رہا تھا۔ دائیں طرف تکیے کے نیچے دبا ہوا چابیوں کا گچھا ہر کروٹ پر سرک کر آگے کو آ جاتا تھا۔

ڈاکٹر نے اپنا بیگ پھر کھولا اور دیر تک اندر آنکھیں ڈالے کچھ ٹٹولتا رہا۔ پھر خواب آور دوائی کے چند قطرے لمحہ بھر کو گلاس کی سطح پر کانپے اور تحلیل ہو گئے۔ کمرے میں پھیلا ہوا سناٹا اور گہرا ہو گیا۔

اس وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ دھندلی روشنی میں کمرے میں داخل ہوتے ہوئے نوجوان کے نتھنے پھڑپھڑائے اور اس نے ایک گہرا اور طویل سانس لیا اور پھر کھڑکی کا پٹ کھول کر کھڑکی کے راستے داخل ہوتی ہوئی تازہ ہوا کو پینے لگا۔

"صاحبزادے، کھڑکی بند کر دو،" ڈاکٹر نے تنبیہ کی۔ "کھڑکی کے راستے آتی ہوئی سرد ہوا مریض کے لیے نقصان دہ ہے۔"

نوجوان نے کھلی ہوئی کھڑکی بند کر دی اور صوفے پر بیٹھ گیا اور اپنے جوتے سرخ ایرانی

قالین میں گاڑ دیے۔ قالین کی نرمی اور گدازپن کا احساس اس کو اُس وقت ہوا جب کھلے ہوے دروازے میں کھڑے ہو کر روسی نے زور سے چھینک لی اور اپنی نرم و ملائم دُم پر زبان پھیری۔

روسی بدرالدین کی موت کا بھی ساتھی ہے۔ وہ اس چار دن کے عرصے میں، جب سے سیٹھ صاحب بستر پر پڑے تھے، آدھا بھی نہیں رہا تھا۔ بس کمرے میں پلنگ کے قریب بیٹھا اداس اور بے معنی نظروں سے سب کو تکا کرتا تھا۔ اس کی بھوری اور ریشم کی طرح ملائم جلد پر جگہ جگہ چکتے سے پڑ گئے تھے اور پچھلی رات سے تو وہ برابر چھینک بھی رہا تھا۔ اس نے کرسی پر بیٹھے ہوے نوجوان پر نفرت سے نظر ڈالی۔ دو تین چھینکیں لیں اور اپنی دم دبا کر بیچ دروازے میں ہی بیٹھ گیا۔

"کتے سے زیادہ چوکس دربان اور کون ہو سکتا ہے؟" ڈاکٹر نے نرس سے کہا۔

"سیٹھ صاحب بھی تو زندگی بھر انسان کے حلق کا نوالہ چھین کر کتوں کے آگے ڈالتے رہے ہیں۔ اب ڈاکٹر یہ دیکھنا ہے کہ سیٹھ صاحب کی موت بھرا ہوا تھال کس کی جھولی میں گراتی ہے،" نرس نے کہا۔

"اس کے حق دار تو صاحبزادے غلام علی ہی ہیں۔ کیوں صاحبزادہ صاحب؟" ڈاکٹر نے نوجوان سے کہا جو گردن جھکائے صوفے پر بیٹھا تھا اور لحہ بہ لحہ گھٹتے بڑھتے سیٹھ صاحب کے سانسوں کو گویا گن رہا تھا۔ اس کے چہرے پر اضطراب اور بے چینی کے اثرات تھے۔ یہ نوجوان ابھی ابھی ڈھائی سو میل کا سفر طے کر کے آیا تھا۔ اس کو اپنے دوست سے جو سیٹھ صاحب کا سکریٹری تھا، ان کی بیماری کی اطلاع ملی تھی اور وہ فوراً ہی پہلی گاڑی سے چل پڑا تھا۔ یہ نوجوان سیٹھ صاحب کے بڑے بھائی کا لڑکا تھا اور اس سے سیٹھ صاحب کو بس اتنا تعلق تھا کہ اُسے سیٹھ صاحب نے سفر خرچ دے کر انجینیرنگ کی اعلیٰ تعلیم کے لیے جرمنی بھیج دیا تھا اور جب وہ انجینیرنگ کی ڈگری مع ایک عدد جرمن بیوی اور دو بچوں کے لے کر آیا تھا تو سیٹھ صاحب نے فوراً ہی اپنی رقم کی واپسی کا مطالبہ شروع کر دیا تھا۔

اور غلام علی جب سے ہی اس وقت کا منتظر تھا۔ وہ وقت جب سب اگلے پچھلے رشتے جتائے جا سکتے ہیں؛ جب صرف آنکھوں کے راستے بہتے ہوے چند قطرے ٹوٹے ہوے تمام رشتوں کو مضبوطی کے ساتھ جوڑ دیتے ہیں۔ پھیلے پھیلے بڑھتے سائے، گھٹن اور پھر سب سے بڑھ کر دبی دبی

سسکیاں ہر دوری کو پاٹ دیتی ہیں اور پھر سب اپنے ہوتے ہیں۔ ایک زندگی منزل پر پہنچتی ہے اور بہت سی زندگیاں منزل کا سراغ پا لیتی ہیں اور پھر بہت سے غلام علی اور بہت سی ڈائنائیں لمبے لمبے ہاتھ بڑھا کر کچھ تلاش کرتے ہیں اور دور کھڑا السیشین کتا مُردار کو دیکھ کو سڑک سے دور ہٹ جاتا ہے۔ اس وقت فضا میں ایک ناخوشگوار بدبو پھیل جاتی ہے اور سب بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ویرانی پہرے دار بن کر کھڑی رہتی ہے؛ صرف ویرانی، جو پہرے دار بھی ہے اور چور بھی۔

''کلائی کی گھڑی اور انگوٹھی اتار لینی چاہیے۔ ڈرگز کے استعمال سے اعضا کے سوجنے کا بھی خدشہ ہے،'' ڈاکٹر نے نرس سے کہا۔

اور نرس نے سیٹھ صاحب کی درمیانی انگلی میں پھنسی ہوئی انگوٹھی اتار کر اپنی انگلی میں ڈال لی۔ ڈاکٹر مسکرایا اور کلائی پر بندھی گھڑی کی چین کھل کر اس کے قدموں میں آ پڑی۔ صوفے پر بیٹھا نوجوان چونکا اور میز پر رکھی ہوئی ٹارچ اٹھا کر کمرے سے باہر چلا گیا۔ باہر نکل کر اس نے ٹارچ روشن کی اور دیر تک اندھیرے گھپ کمروں میں کچھ تلاش کرتا رہا۔ کمرے جو سیٹھ صاحب کی ویران زندگی کی طرح بھائیں بھائیں کر رہے تھے، ان کے ایک ایک کونے میں غلام علی کچھ تلاش کر رہا تھا، ڈھونڈ رہا تھا اور ہانپ رہا تھا۔ لکڑہارے کے انھی لڑکوں کی مانند جو شام پڑے لالٹین کی لو مدھم کر کے جنگل کی طرف نکل جاتے تھے اور زمین کھودنی شروع کر دیتے تھے، وہ زمین جو خزانے کو چھپائے ہوئے تھی۔ جوں جوں وہ کھدائی کرتے تھے زمین سمٹتی جاتی تھی۔ سکڑ کر ایک تنگ سرنگ میں تبدیل ہوتی جاتی تھی۔ وہ لالٹین کی بتی بڑھاتے تھے اور کدال اور پھاوڑے کندھوں پر رکھ کر تھکے ہارے قدموں سے گھر کی طرف چل پڑتے تھے۔ مگر خزانے کی کشش پھر ان کو جنگل میں لے جاتی تھی اور وہ کھدائی شروع کر دیتے تھے۔ زمین اور سمٹتی اور سکڑتی، حتیٰ کہ چوہے کے بل کی شکل اختیار کر لیتی تھی۔ تب تینوں حیرت سے ایک دوسرے کو دیکھتے تھے اور ماتھے پر آیا ہوا پسینہ پونچھتے ہوئے گھر کی طرف چلے جاتے تھے۔

''نرس، اب مجھے چلنا ہی چاہیے،'' ڈاکٹر نے کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی میں وقت دیکھا اور دروازے سے نکل گیا۔

سیاہ کولتار کی سڑک پر میونسپلٹی کی گاڑی جوں کی طرح رینگ رہی تھی۔ بہت سے پرندے

ادھر اُدھر اڑ رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھا ہوا پتھر کی آنکھ والا جمعدار احدی پن سے تہبند کی گرہ کستا ہوا گاڑی سے اترا اور سڑک کے کنارے پڑے ہوئے مردہ کتے کی بچی کھچی ہڈیوں کو گاڑی میں ڈالتے ہوئے خوش گواری سے بولا:

"کیا سوکھے چمرخ کتے مرتے ہیں! نہ ماس نہ بوٹی، نری کھال ہی کھال ہے۔ کوئی موٹا تازہ مرے تو بات بنے۔ کیوں ڈاکدڑ صاحب؟" جمعدار نے سڑک پر چلتے ہوئے ڈاکٹر کی طرف آنکھ مار کر کہا۔

بدرالدین کی بیماری معمولی نہیں تھی۔ دماغ کی رگ پھٹ چکی تھی۔ کسی بھی وقت ختم ہونے کا اندیشہ تھا۔ ان کے اس جان لیوا مرض سے سب لوگ واقف ہو چکے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ جوں جوں سیٹھ صاحب کے چہرے پر موت کی زردی کھنڈتی چلی آ رہی تھی، گھر کے اندر اور گھر کے باہر زندگی پورے شباب پر رواں دواں دکھائی دیتی تھی۔ سیٹھ صاحب کی کوٹھی میں چار دن پہلے ایک سیٹھ صاحب، چار کتے اور ان کے تین نوکروں کے علاوہ پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا۔ اب اس کوٹھی کے سب کمرے بھرے ہوئے تھے۔ اور ادھر بیٹھک کے برابر والے کمرے میں سیٹھ بدرالدین کا سر دا اکڑا ہوا جسم سفید بستر پر کھوکھلے بانس کی طرح پڑا تھا۔

"نرس، گلوکوز دو،" سیٹھ بدرالدین نے نقاہت سے کہا۔

غلام علی کی بیوی ڈائنا نے آگے بڑھ کر گلاس سیٹھ صاحب کے منہ سے لگا دیا۔ سیٹھ صاحب کی نگاہیں ڈائنا کے چہرے پر جم کر رہ گئیں اور پھر وہ چیخ پڑے: "ہٹا لو، یہ ہاتھ چبھ جائیں گے۔"

ڈائنا نے اپنے بڑھے ہوئے ناخنوں کو دیکھا۔ تازہ پالش کیے ہوئے سرخ سرخ ناخن بالکل چیل کے پنجوں سے مشابہ تھے جیسے ابھی ابھی کسی تازہ مردار کو نوچ کھسوٹ کر آئے ہوں اور جن پر تازہ تازہ خون قطرہ قطرہ ہو کر جم گیا ہو۔

"کیا بات ہے؟" غلام علی نے سرگوشی کے انداز میں پوچھا۔

"کوئی بات نہیں، تم بے فکر رہو۔ اضطراب بڑھ رہا ہے۔ تم اسٹور خالی کرا لو۔ کتوں کو ابھی بھیج دو، ورنہ آج شام کی ٹرین سے جو نئے لوگ آ رہے ہیں وہ کھنڈٹت ڈالیں گے۔ کتے اصل

نسل السیشین ہیں۔ اگر فروخت بھی کیے تو کافی پیسہ ملے گا۔ میں ابھی اِدھر ہی ہوں۔ نرس آتی ہی ہو گی۔ دیکھو، اس طرف دیکھو۔ سانس اکھڑ رہی ہے۔" ڈائنا نے سیٹھ صاحب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غلام علی کو بتایا اور خود رسالہ لے کر بیٹھ گئی۔

"میم صاحب! ہم تمہارے صاب کو بول دیا ہے کہ روسی کو کوئی ہاتھ نہیں لگائے گا۔ روسی کو ہم لیں گے۔ ہم نے بڑا محنت اٹھایا ہے اس کو پالنے میں۔ اگر تم لوگ نے دھاندلی کی تو ہم شور مچاتا ہے اور سب آجو باجو والے کو کھڑا کر کے تمہاری بات بتاتا ہے۔ نیا گیسٹ جوابی آئیں گا اس کو اسٹور والی بات بتائیں گا۔ پر روسی کو ہم ضرور لیں گے،" بوڑھی آیا نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"آیا، تم اتنا شور کیوں کرتا ہے؟ اگر شور کرے گا تو ہم تم کو کوٹھی سے باہر نکلوا دے گا،" ڈائنا نے غصے سے کہا۔

"ہم کو؟" بوڑھی آیا نے سینے پر ہاتھ مار کر پوچھا اور اس کی اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں حیرت سے پوری کی پوری پھٹ گئیں اور پھر وہ بولی:

"ہنھ! کوئی ہم کو کوٹھی سے باہر کر سکتا ہے؟ کس کا پاور ہے؟ ہم نے اس کوٹھی میں اپنا لائف گزارا ہے۔ تم تو ابی دو دن سے آیا اور مالک بن گیا!"

"تم بکواس بند کرتا ہے یا ہم صاحب کو بلائے؟" ڈائنا نے غصے سے پیر پٹختے ہوئے کہا۔

"صاحب کو! کاں سے آئیں گا صاب؟ بے چارا صاب تو مر رہا ہے۔ بیڈ پر پڑا ہے۔ صاب آتا تو پھر کیا تھا۔ تم کوٹھی میں آسکتا تھا؟ تم روسی، ٹامی، بیٹر اور چینی کو لے جا سکتا تھا؟ آمارا بچہ۔ ہو۔ ہو۔" آیا نے کھڑے ہی کھڑے زور زور سے رونا شروع کر دیا۔

"اے لی۔ علی! آیا لوگ اِدھر شور کھڑا کیا۔ ڈیڈی بیمار ہے اور یہ شور کرتی ہے۔ اس کو باہر کرو،" ڈائنا نے باہر نکل کر علی کو پکارا۔

غلام علی نے آیا کا ہاتھ پکڑ کر باہر کر دیا اور خود اسٹور میں گھس گیا۔ اسٹور ایک چھوٹا سا تاریک کمرہ تھا، جس کی دیواروں پر گز گز بھر تک سیاہ پینٹ کیا ہوا تھا اور جس میں کوئی روشن دان یا کھڑکی نہیں تھی۔ اس کمرے میں جاڑے، گرمی، برسات تینوں موسموں میں ایک بساندی سی بو

آتی رہتی تھی۔ علی نے ٹارچ کی روشنی کمرے میں ڈالی۔ روشنی کی لکیریں سیاہ دیوار پر کانپیں اور علی نے پھر تلاش شروع کر دی۔

وہ خوب ڈھونڈتا تھا۔ خوب تلاش کرتا تھا۔ تھک جاتا تھا تو دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ جاتا تھا اور پھر ڈھونڈنا شروع کر دیتا تھا۔ وہ ہانپ ہانپ کر ایک ایک چیز کو ٹٹول رہا تھا۔ لمبے لمبے ہاتھ ڈال کر کچھ تلاش کر رہا تھا۔ مسلسل محنت سے اس کی ماتھے کی رگیں پھول آئی تھیں۔ پھر بھی اس کی تلاش جاری تھی۔ اس نے گھٹنے زمین پر ٹیک دیے اور زمین پر تھک ہار کر بیٹھ گیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔ ان لالچی لڑکوں کی طرح جو پھر شام پڑے کدال اور پھاوڑے لے کر اور لالٹین کی لو مدھم کر کے جنگل کی طرف نکل جاتے تھے اور پھر زمین کھودنی شروع کر دیتے تھے یہاں تک کہ وہ ایک تنگ سوراخ میں تبدیل ہو جاتی۔ تینوں لڑکے زور لگا لگا کر مٹی نکالتے تھے اور پھر تھک ہار کر بیٹھ جاتے تھے۔ تب بڑے بھائی نے کہا تھا:

"سوراخ کے اندر جھانکو۔"

منجھلا بھائی بولا: "بھائی تُو جھانک کیوں کہ تو بڑا ہے۔" پھر چھوٹا لڑکا جو تینوں میں زیادہ عقل مند اور سمجھ دار تھا، بولا:

"بھائی آج رہنے دے کہ اندھیرا بڑھ چلا ہے۔ کیڑا مکوڑا ڈس لے گا تو ہم کیا منہ لے کر گھر جائیں گے۔"

یہ بات تینوں کے دل کو لگ جاتی اور وہ لالٹین کی لو بڑھا کر کدال اور پھاوڑے کندھوں پر رکھ کر تھکے تھکے قدموں سے گھر کی طرف چل دیتے تھے۔

اور دوسرے دن جب پھر ڈاکٹر قصرِ بدر میں داخل ہوا تو بدرالدین کی حالت اور بگڑ چکی تھی۔ ان پر غشی طاری تھی۔ سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ کمرے میں نرس، غلام علی اور اس کی بیوی کے علاوہ ایک اور بھورے بالوں والا نوجوان اضطراب سے اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا۔ نرس بے چین تھی اور سرہانے کھڑی تکیے کے نیچے رکھے ہوئے سنہری زنجیر والے چابی کے اس گچھے کو تلاش کر رہی تھی جس کی زنجیر بڑی بھی تھی اور خوب صورت بھی اور جو بہ آسانی گلے میں پہنی جا سکتی تھی، اور جو ابھی ابھی تکیے کے نیچے تھا مگر اب آنے والے نئے مہمان کی جیب میں تھا اور اس کے ہر قدم پر چھن

سے بج اٹھتا تھا۔

کمرے میں ٹہلتا ہوا نووارد آگے بڑھا اور علی سے سرگوشی کے انداز میں کچھ کہا۔ پھر وہ دونوں کمرے سے نکل گئے۔ اندھیرے میں انھوں نے ٹارچ کی لائٹ ڈالی اور کچھ ڈھونڈنے لگے۔

وہ ڈھونڈ رہے تھے۔ تلاش کر رہے تھے۔ ٹارچ ہاتھ میں لے کر زنگ خوردہ تالوں میں چابیاں ڈال رہے تھے۔ اندھادھند چابیوں کو گھمار ہے تھے۔ سالہاسال سے بند تالے زنگ کی دبیز تہہ سے بالکل جڑ گئے تھے۔ تب وہ ٹارچ کی روشنی تالوں کے سوراخ میں ڈالتے اور اپنی نظریں ان میں گاڑ دیتے تھے۔ آگے بڑھ بڑھ کر جوتوں سے زنگ خوردہ تالوں پر ٹھوکریں مارتے اور سر پکڑ کر رہ جاتے۔ ان بے صبر لڑکوں کی طرح جو پھر شام پڑے لالٹین کی لومدھم کر کے جنگل کی طرف نکل جاتے تھے اور آنکھ بند کر کے تنگ سوراخ میں جھانکتے تھے تو ان کو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا سوائے اندھیرے کے جو چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

تب وہ سر پکڑ کر بیٹھ جاتے تھے اور پریشان پریشان گھر کی طرف چل دیتے تھے۔

"کچھ نہیں ہے،" بدرالدین نے کمزور آواز میں کہا اور آنکھیں بند کر لیں۔

"نرس، ٹانگیں سیدھی کرو۔ سلنڈر ہٹا لو۔ اب تجہیز و تکفین کا بندوبست بھی کرنا ہے،" ڈاکٹر نے بدرالدین کے منھ پر چادر ڈالتے ہوئے نرس سے کہا۔

"گھر خالی ہے۔ کمرے خالی ہیں۔ تجوری خالی ہے۔ سب جا چکے ہیں۔ صرف ان سوکھی ہڈیوں کے علاوہ تھا بھی کیا۔ نرس، یہ تمھارا حصہ ہے،" ڈاکٹر نے تمسخرانہ انداز میں کہا اور سیٹھ صاحب کے دستانے جیب میں ڈالتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

نرس نے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ خالی کمرے کو خوب ٹٹولا۔ پلنگ پر پڑی ہوئی لاش کے بستر کے نیچے ہاتھ بڑھا بڑھا کر کچھ ڈھونڈا اور گھبرا کر دروازے سے باہر نکل گئی۔ حواس باختہ سی۔ لکڑہارے کے اس عقل مند چھوٹے لڑکے کی طرح جس نے تنہا شام پڑے زمین کھودی تھی اور اس کو حیرت ہوئی تھی کہ زمین سکڑ نہیں رہی تھی بلکہ سوراخ بڑھتا جا رہا تھا یہاں تک کہ وہ ایک بڑے گڑھے میں تبدیل ہو گیا تھا۔ تب اس نے گڑھے میں جھانکا تھا اور چیخ مار کر پیچھے ہٹ گیا تھا:

"مردار ہے، مردار!"

پھر اس نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا تھا۔ خاک دھول سر پر ڈال لی تھی اور روتا پیٹتا ہوا گھر کی طرف چل دیا تھا کہ بابا کی موت آج ہی ہوئی تھی۔

لمبا ہاتھ

میں نے آنکھیں کھولیں تو سب کچھ وہی تھا۔ صرف دیوار پر مکڑی کے جالے میں ایک چیونٹا اٹک کر رہ گیا تھا۔ وہ برابر مکڑی کی گرفت سے نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مکڑی نے اپنی دونوں آگے والی ٹانگیں اس کی کمزور گردن میں گاڑ رکھی تھیں اور اوپر سے پیلے باریک تار کی چھتری نے اس کے جسم کو ڈھانپ رکھا تھا۔ چیونٹا تڑپ رہا تھا اور باہر نکلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ غیر ارادی طور پر میں نے ہاتھ بڑھایا اور پھر میں نے دیکھا میرا ہاتھ بڑھتا ہی چلا گیا۔ بڑھتے بڑھتے پہلے ایک ٹہنی کی شکل میں تبدیل ہوا، پھر پورا کا پورا مضبوط بانس بن گیا، گٹھا ہوا سخت اور مضبوط بانس۔ اب میرے پاس بانس کے برابر لمبا اور مضبوط ہاتھ تھا اور وہ سب کچھ کر سکتا تھا جو مجھے کرنے کی خواہش تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر مکڑی کا جالا دیوار پر سے چھٹا دیا۔ چیونٹا اور مکڑی ایک ساتھ دیوار پر سے گر پڑے اور میں نے فوراً اپنا پیر ان پر رکھ دیا۔ کالا اور مٹیالا خون اور پانی کا گدلا گدلا لیپ زمین پر ایک چکتے کی صورت میں جم کر رہ گیا۔

میرا ہاتھ مجھ سے چار چار فٹ آگے چل رہا تھا اور آس پڑوس والوں، خصوصاً بچوں کے لیے اچھا خاصا تماشا بنا ہوا تھا۔ لکڑ بھگا لکڑ بھگا کہہ کر انھوں نے محلّہ سر پر اٹھا لیا تھا اور پھر قطار باندھ کر اچھلتے کودتے، تالیاں بجاتے میرے پیچھے پیچھے چل پڑے تھے۔ میں نے پورن کے کنویں میں ہاتھ ڈال کر کمسن راج کمار پورن کو کنویں سے نکالا۔ پورن نے مجھ سے کہا:

"میرے ہاتھ پیر تو کنویں کی تہہ میں رہ گئے ہیں۔"

میں نے پھر کنویں میں ہاتھ ڈالا اور پورا کنواں کھنگال ڈالا مگر پورن کے ہاتھ پیر نہیں ملے۔
میں نے پورن سے کہا:
"لڑھکتے لڑھکتے میرے پیچھے پیچھے چلے آؤ اور بچوں کی اس پلٹن میں شامل ہو جاؤ۔ ان انسانی کیڑے مکوڑوں نے میری زندگی اجیرن کر دی ہے۔"
بچے اوندھے سیدھے، بدحواس اور بے تحاشا بھاگ رہے تھے۔ پورن لڑھکتا لڑھکتا ان کے قریب پہنچ گیا تھا۔
مستری کرم دین کا آٹھ سالہ لڑکا راجو ہانپ رہا تھا اور بار بار کنویں کے اندر جھانک رہا تھا۔ رانی کنویں کے اندر گر گئی تھی۔ وہ پورن سے ڈر کر چھپنے کی کوشش میں کنویں میں گر پڑی تھی۔
"میں ابھی رانی کو کنویں سے نکال دیتا ہوں۔"
پھر میں نے اپنا لمبا ہاتھ کنویں میں ڈالا۔ دائیں بائیں اندر باہر سب طرف گھما گھما کر رانی کو ڈھونڈا۔ میں پسینے سے شرابور ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھ نے گلگلی چیز کا لمس محسوس کیا۔ بھیگے بالوں کی لٹیں میرے ہاتھ پر چمٹ گئیں۔ میں نے زور سے بالوں کی لٹوں کو پکڑ کر اوپر کی طرف گھسیٹ لیا اور راجو کے سامنے زمین پر ڈال دیا۔ رانی بے سدھ اور بے دم پڑی تھی۔ پیلی زرد رنگت لیے لمبی لمبی لیٹی تھی، اور راجو دھاڑیں مار مار کر رو رہا تھا۔
اب سے پہلے مجھے اپنے جسم کے ہر عضو سے نفرت تھی۔ لمبے اور زرد ہاتھ پیر جن کے سروں پر انگلیاں چپکی ہوئی تھیں گویا کسی بچے نے کاغذ کے کنٹوپ بنا کر انگلیوں پر پہن لیے ہوں۔ ناخن گوشت کے اندر پیوست ہو کر رہ گئے تھے۔ چھوٹے سے چہرے پر بڑی سی ناک جس پر جاڑے گرمی اور برسات ہر موسم میں پسینے کے قطرے چمکتے رہتے تھے اور آنکھیں ابلتی ہوئی، باہر کو نکلتی ہوئی سرخ انگارہ آنکھیں۔ میں نے برسوں سے شیشے میں شکل نہیں دیکھی ہے اور پھر لوہے کے ان آہنی پردوں کے پیچھے شیشے ہیں بھی کہاں؟ یہاں تو صرف ایک دوسرے کو دیکھ کر ہی اپنی شکل کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نمبر تیس میں ایک لمبی خوبصورت چوٹی والی لڑکی ہے۔ اس کی آنکھیں بھی ابلتی رہتی ہیں۔ پانچ اور پانچ دس انگلیوں والے جب گردن پر پڑتے ہیں... اف خدایا! زینب، بسنتو اور چھنگو کی گردن پر یہی دس انگلیوں والے ہاتھ پڑے تھے۔ بھوک بھوک کہہ کر ہلکان

ہوے جاتے تھے اور زینب روز ایک ہی رٹ لگائے رکھتی تھی۔ ندیدی۔ روٹی روٹی پکارتی ہوئی مر گئی۔ ان ہاتھوں کی گرفت سخت ہوتی گئی، سخت اور تنگ، بالکل اس سامنے والے دروازے میں لٹکے ہوے پردے کے آہنی چھلے کی طرح تنگ۔ اور پھر زینب، بسنتو اور چھنکو کی آنکھیں ابلنے سی لگیں اور باہر کو نکلنے لگیں۔ نمبر تیس کی خوبصورت آنکھوں والی لڑکی کی طرح ساری کی ساری ابل پڑیں اور اس کے ساتھ ہی گردن کے ساتھ چپکی ہوئی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑنی شروع ہوئی اور ہاتھ کندھے کے سہارے جھولنے لگا۔

آنکھیں کھولیں تو میرے کندھے کے ساتھ بانس کے برابر لمبا تڑنگا ہاتھ لٹک رہا تھا۔ میں خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔ پھر میں نے بہت سے کام کیے۔ میں نے کنویں کی تہیں کھنگال ڈالیں۔ میں نے سمندر کو گھنگھول ڈالا اور میں نے اونچے اونچے پہاڑ کی چوٹیوں پر اگنے والی خاردار جھاڑیوں کو نوچ کھسوٹ کر پھینک دیا، کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ جب ہندو یاتری اپنے مذہبی سفر سے پلٹتے ہیں تو جوتے اتار دیتے ہیں اور ان کے پیروں میں ببول کے کانٹے چبھ جاتے ہیں۔ پھر قریب کے آشرم سے کوئی بال ودھوا چٹکی بھر آٹے کا پلٹس پکا کر لاتی ہے اور زخم پر مرہم پٹی کر کے چلی جاتی ہے۔ اب میں نے پہاڑی راستوں پر سے ان کانٹوں اور جھاڑیوں کو اکھاڑ پھینکا ہے جو یاتریوں کے مذہبی سفر میں رکاوٹ بنتے تھے۔

نرس مجھے روز ایک گولی دے کر چلی جاتی ہے۔ ابھی میں نے گولی کھائی ہے اور ابھی سے آنکھوں کے گرد بھنگے سے ناچنے لگے۔ ابھی تھوڑی دیر بعد سارے اعضا سکڑنے لگیں گے۔ ہاتھ کے آخری سرے پر خوب خارش ہو گی۔ مجھے گولی کھانے کے بعد ہمیشہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہاتھ کے آخری سرے پر کوئی چیز اُبھر رہی ہے، چھوٹی چھوٹی گانٹھیں سی۔ رحیم بھائی کہتا ہے:

"انگلیاں ہیں!" انگلیوں والے تمام ہاتھوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ انسانی جسم کے ساتھ چپکے ہوے ہاتھ کس قدر کمزور اور بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ مگر جب گردن پر پڑتے ہیں، برابر کے پلنگ پر لیٹے ہوے رحیم بھائی کے ہاتھ... اس نے ان ہاتھوں سے خوب اپنا درآمد و برآمد کا کاروبار چمکایا تھا اور جب میاں جی کو گھاٹا ہوا تو گالوں پر ان ہی ہاتھوں سے طمانچے مارتا ہوا گلیوں گلیوں پھرا۔ محلّے والوں نے کہا، "ولی ہو گیا ہے۔" توبہ استغفار کا یہی ڈھنگ اس کو سوجھا۔ اگر ولی

ہوتا تو کسی کونے بچالے میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرتا۔ یہ کیا کہ منھ کو طمانچوں سے سرخ انگارہ کیے شہر میں پھر رہا ہے۔ اس کو اٹھاتا ہوں۔

"سیٹھ جی! اے سیٹھ جی! اے رحیم بھائی! ارے میاں درآمد برآمد والے! وہ اپنے ہاتھ کو تو دیکھو پٹی کھل کر نیچے گر پڑی ہے، اور پھاہے کے اندر سے جو چھنگلیا کی پور جھانک رہی ہے اس میں کس کی نشانی پہن رکھی ہے؟"

"اس وقت ہاتھ کے آخری سرے پر کھجلی ہو رہی ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ یہ گانٹھیں اگر اسی رفتار سے بڑھتی رہیں تو یقیناً انگلیوں کی صورت اختیار کرلیں گی۔ معلوم نہیں نرس کیا دوا دے رہی ہے؟"

"دھتورا، میاں مختار، دھتورا۔ وہ ہم سب کو روز صبح دھتورے کی چٹکی پھنکا کر چلی جاتی ہے۔ تب ہی تو میں، تم، کلثوم، باقر اور غنی ایک سے خراٹے لیتے ہیں اور اگر یہ چٹکی نہ دے تو پھر ہم سب مل کر اس کا گلا دبا دیں گے!"

"کیسی باتیں کرتے ہو درآمد برآمد والے سیٹھ بہاری مل! ارے معارف کرنا رحیم بھائی۔ میرا یہ لمبا ہاتھ گلا دبانے کے لیے نہیں ہے۔"

"بہک رہا ہے۔ دیکھ لینا سو جائے گا۔ پھر دوبارہ پندرہ گھنٹے تک سوتا رہے گا۔ پھر غنی اور ہم دونوں مل کر اس کے تکیے کے نیچے دبے ہوئے اس فوٹو کو نکالیں گے جس کو دیکھ دیکھ کر یہ روتا ہے۔ ضرور اس کی زندگی میں کوئی غمی ہے۔"

"غم سے کس کو رستگاری ہے! ہم سب کا اپنا اپنا ایک غم ہے۔"

"میرے دو غم ہیں۔"

تم یہاں پر بھی اپنی کاروباری دھاندلی سے باز نہیں رہ سکتے؟ توبہ توبہ، کرتے ہو پھر وہی چور بازاری کی باتیں! یہاں یہ منافع خوری نہیں چلے گی۔ بس ایک غم۔ سب کا ایک غم۔"

"تم تو سو رہے تھے میاں مختار!"

"میں سوتے میں بھی جاگتا ہوں۔ تم نے سوتے جاگتے ابوالحسن کی کہانی سنی ہے؟ سخی تھا۔ ایک ہاتھ سے خیرات کرتا تھا۔ دوسرے کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی۔ ذرا دیکھنا، پلاسٹر کے اندر یہ

ابھری ابھری کیا چیز ہے؟"

"انگلیاں ہیں میاں، انگلیاں۔"

"نہیں!" انگلیوں والے ہاتھوں سے مجھے وحشت ہوتی ہے۔ انھوں نے زینب کا گلا دبایا تھا۔ بسنتو کی گردن مروڑی تھی اور چھنگو کو جو صرف تین گھنٹے کا تھا اور جس کی پیدائش کے بعد زینب نے کہا تھا، مختار یہ تیرا سیدھا ہاتھ ہے۔ اب نہ کہنا کہ میں اکیلا ہوں۔ بڑا ہو گا تو تیرا سہارا بنے گا۔ اور تب ہی میں نے گوشت کے لوتھڑے کو دیکھا تھا۔ سفید چہرے پر سیاہ آنکھیں اس طرح چمک رہی تھیں جیسے گھنٹا گھر کی گھڑی میں لگے ہوئے ہندسے۔ میں نے اس وقت بھی اس کے گال پر نفرت سے ایک طمانچہ مارا تھا، زینب کی نظر بچا کر۔ مجھے معلوم تھا کہ اس کے لیے دودھ کی فکر کرنی ہے۔ زینب کی سوکھی چھاتیوں میں کون سی دودھ کی نہریں بہہ رہی تھیں۔ وہ تو جب ہی سوکھ چکی تھیں جب بسنتو تین مہینے کی تھی۔ اس لیے چھنگو کو چومنے کی بجائے میرے دل میں یہ خواہش اُبھری تھی کہ اس کا گلا دبا دوں۔ لیکن زینب نے اچک کر اس کو میرے ہاتھوں سے چھین لیا اور مجھے گھورا اور پھر خود اس گوشت کے لوتھڑے کو چومنے لگی اور جب ہی میں نے زینب کی گردن دبا دی تھی، بسنتو کا گلا گھونٹ دیا تھا اور چھنگو کو دیوار سے جا پٹخا تھا اور پھر جب میں نے آنکھیں کھولیں تو پھول کی طرح ہلکا تھا۔ سڑک کے بچے لکڑ بھگا لکڑ بھگا چلا رہے تھے اور میں خوش تھا۔

تم لوگوں نے زینب کو نہیں دیکھا۔ گیہوں کی فصل کٹ کر تیار ہو گئی تھی۔ زینب بڑے سے کھلیان پر بیٹھی ہوئی تھی اور بھوسا اُڑا رہی تھی اور لہک لہک کر گا رہی تھی:

"اے گیہوں کی بالیو، تم دھرتی کا گہنا ہو جس پر چڑیاں چہک رہی ہیں اور ایک چڑیا گیہوں کے سنہرے تاروں کی ہنسلی پہنے گالوں پر گلاب کھلائے بیٹھی ہے کہ شاید پُروائی چلے اور بھوسا دور تک اُڑتا جائے اور چڑے کو خبر دے۔ فصل کٹ چکی ہے۔ زمین سونے سے چمک اُٹھی ہے۔ آؤ سنہری فصل تیار ہے۔"

وہ یہ گانا شادی کے بعد گاتی تھی، اونچے اونچے سروں میں، دھیمی دھیمی آوازمیں، چلتے پھرتے بس گاتی ہی رہتی تھی۔ اس کو سنہری فصلوں سے پیار تھا۔ گیہوں کے خوشوں سے عشق تھا۔ میں کہتا تھا "زینب نہ گا، کوئی راجا پکڑ کر لے جائے گا۔" "لے جائے تو لے جائے۔

سرکنڈے کی گاڑی بنا کر پودنا چھڑا لائے گا۔" مجھے اس گانے سے نفرت ہوتی گئی، خواہ مخواہ کی نفرت۔ میں سوچتا یہ کیسی عورت ہے؟ گیہوں کے ڈھیر پر پلنے والی یہ نشیاری عورت دیوانی نہیں تو اور کیا ہے؟ فاقوں پر نوبت ہے اور پھر بھی سنہری فصل تیار ہے کا نغمہ الاپ رہی ہے۔ اصل میں اس کو زندگی سے بے طرح پیار تھا۔ تم نے زینب کو نہیں دیکھا؟ دیکھا تو ہے اور روز ہی دیکھتے ہو۔ عورتیں سب ایک جیسی ہوتی ہیں۔ یہ نرس جو روز صبح سویرے ہم سب کو ایک زرد گولی دیتی ہے زینب ہی تو ہے، سوئی سوئی آنکھیں اور بھنچے ہوئے لب والی زینب۔ اور نمبر تیس میں لمبی خوبصورت چوٹی والی لڑکی ہے نا وہ بھی زینب ہے، کھل کھل کر ہنسنے والی زینب۔ لیکن اب زینب بالکل خاموش ہے اور اس خاموش زینب سے مجھے خوف آتا ہے۔ دیکھو! اس تصویر کو دیکھو۔ زینب کے ہونٹ بھنچے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے کے ساتھ بالکل چپک گئے ہیں۔ مگر پتا ہے جب یہ بولیں گے... اور میں اس وقت سے ڈرتا ہوں۔

طاقتور ہاتھ نے مجھے بالکل بدل دیا ہے۔ جس شکن کا احساس لے کر میں یہاں آیا تھا، وہ بالکل مٹتا جا رہا ہے۔ بس ہاتھ کے سرے پر خارش ہوتی ہے۔ گانٹھوں پر یہ محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی ان کو نوچ رہا ہے۔ آری سے چھیل رہا ہے۔ شاید یہ دوا کا اثر ہے۔ اگر اس دوا سے میرا ہاتھ عام ہاتھ کی شکل اختیار کر لے گا تو میں ایک بار پھر زینب کا گلا گھونٹ دوں گا، اس زینب کا جو روز مجھے گولی دیتی ہے۔ پیلی پیلی زرد گولی جیسے بسنتو کی آنکھوں میں کنڈتی ہوئی زردی، یا چھٹکو کے مرجھائے ہوئے زرد گال۔ کمرے کے سب روشن دان بند ہیں۔ تمھیں بھی گرمی لگ رہی ہے۔ میں لیٹے ہی لیٹے انھیں کھول دوں گا۔ پھر باہر سے رات کی رانی کی خوشبو آئے گی۔ زینب نے رات کی رانی کا پودا صحن میں لگایا تھا۔ بسنتو روز اس میں پانی دیتی تھی اور جب پھول آنے لگے تو نہ زینب رہی اور نہ بسنتو۔ پھر میں نے اس پودے کو زمین سے اکھیڑ کر باہر گلی میں پھینک دیا۔ تم جب یہاں سے جاؤ تو دروازے کے سامنے مہکتا ہوا رات کی رانی کا پودا لیتے جانا اور زینب اور بسنتو کی قبر کے درمیان لگا دینا۔ یہ چوری ہے اور تمھارا ہاتھ چوری کرنے میں طاق ہے۔ چھوٹا اور کمزور ہاتھ... دس انگلیوں والے ہاتھ سب ایسا ہی کام کرتے ہیں۔

مجھے اب اپنے اس لمبے ہاتھ سے بھی الجھن ہونے لگی ہے۔ اپنی بہت سی خواہشوں کا گلا دبانا

پڑ رہا ہے۔ زرس کی ٹھوڑی کے درمیان چمکتے تل کو چومنے کی خواہش اور رات کی رانی کا پودا چرانے کی خواہش، ایک ساتھ ہی ابھری ہیں۔ کس کس کا گلا گھونٹوں؟ میں کچھ نہ کچھ کر گزروں گا۔

ہر چیز میری پہنچ سے باہر تھی اور ہر چیز مجھے اپنے سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔ میں ہر چیز سے خوف زدہ تھا۔ بھوک سے ڈرتا تھا۔ لباس سے خوف کھاتا تھا۔ بسنتو کو دیکھ کر کونے میں چھپ جاتا تھا۔ زینب کے بھنچے ہوئے لب دیکھ کر سہم جاتا تھا۔ اگر یہ کھل گئے...؟ میں سایوں اور پرچھائیوں سے بھی خوف زدہ تھا۔ دیوار پر اپنا چلتا پھرتا سایہ دیکھ کر سوچتا تھا، "یہ میں تو نہیں ہوں! اتنا بڑا! اتنا گمبھیر! پوری دیوار پر چھایا ہوا میں ہوں؟" مجھے ہر بڑی چیز سے وحشت ہوتی تھی اور ہر چیز اپنے سے بڑی لگتی تھی۔ ننھی بسنتو بھی، جو پانی کا چھوٹا سا بد قلعی گلاس بھر بھر کر کیاری میں لنڈھاتی رہتی تھی یہاں تک کہ اس کا سانس تیز تیز چلنے لگتا تھا۔ پیلے زرد گالوں پر ہلکی ہلکی سرخی جھول آتی تھی۔ پسینے کی قطرے اس کی پیشانی پر چمکنے لگتے تھے۔ تب وہ میلے کچیلے فراک کا کونا اٹھا کر پسینہ پونچھتی تھی اور اس کا پسلیوں کے ساتھ لگا ہوا پیٹ دیکھ کر ڈر جاتا تھا۔ کھونٹی پر سے اپنا سیاہ کوٹ اتارتا، مفلر گلے میں لپیٹتا، جوتوں کو زبردستی پیروں میں ٹھونستا اور طاق پر رکھے ہوئے گول گول مڑے ہوئے کاغذوں کو اٹھا کر باہر نکل جاتا اور پھر شام کو گھر آتا تھا تو زینب کے بھنچے ہوئے لب دیکھ کر پھر ڈر جاتا تھا۔

ہر چیز ہی بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ زینب جس کو میں کندھوں سے پکڑ کر جھلا دیتا تھا اور جو کھل کھل ہنستی ہی رہتی تھی، بالکل چھوٹی سی تھی۔ کھیت میں ایسے کد کڑے لگاتی پھرتی تھی جیسے چتکبری بچھیا۔ جب میں اس کو اپنے گھر لے کر آیا تھا تب بھی سرخ دوپٹہ گلے میں ڈالے، پاؤں کی پازیب چھنکاتی سارے گھر میں گھمر گھمر گھوما کرتی۔ وہ بہت سے اوندھے سیدھے خواب دیکھ کر میرے ساتھ چلی آئی تھی۔ خواب جو ایک پڑھے لکھے آدمی کے ساتھ منسوب ہونے کے بعد سے لڑکیاں دیکھنا شروع کر دیتی ہیں۔ اور زینب کی آنکھوں کے سامنے تو اسی دن سے روشنی کا ہنڈا جل رہا تھا جب میں نے دسویں کا امتحان پورے صوبے میں امتیازی نمبروں سے پاس کیا تھا اور اس کے بابا نے بغیر کسی حیل حجت کے زینب کو مجھ سے بیاہ دیا اور پھر جب میں اس کو اپنے گھر لے آیا اور چارپائی پر بٹھا کر اس کے برابر بیٹھا وہ پھر کھل اٹھی۔ ہنستے ہنستے تھوڑا ہی وقت گزرا تھا

کہ ایک دن لالٹین کی مدھم روشنی میں میں نے دیکھا زینب بھی بڑی ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے اس کو چور نگاہوں سے گھورا۔ وہ مجھے اور بڑی دکھائی دی۔ پہاڑ کی پہاڑ۔ بسنتو کی ماں بن کر وہ اتنی بلند ہو گئی تھی کہ میں اس تک پہنچنے کی کوشش کرتا بھی تھا تو پھسل کر سطح پر آ جاتا تھا اور پھر جب اسی زینب نے چھنکو کو پیدا کیا تو وہ پھیل کر اور بڑی ہو گئی۔ اس کا وجود پورے گھر پر چھا گیا۔ تخلیق کی سرحدوں کو چھو چھو کر سوکھی ماری زینب کتنی بلند ہو گئی تھی!

میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اپنے کو ڈھونڈھتا تھا مگر میں تھا کہاں جو ملتا۔ میں تو زینب، بسنتو اور چھنکو کے گرانڈیل وجود تلے دب کر رہ گیا تھا۔ پھر ہر چیز بڑی ہوتی گئی، ہر چیز پھیلتی گئی۔ رات کی رانی کا پودا لمبا ہو ہو کر جھومنے لگا۔ دیوار پر ان سب کے دیوقامت سائے پھیل کر مجھے ڈرانے لگے۔ تب میں نے اپنے کمزور ہاتھ سے سب کو ختم کر دیا۔ کندھوں کو زور سے جھٹکا۔ ہاتھ کے آخری سرے سے کوئی چیز ٹوٹ کر نیچے گری۔ شاید داہنا پنجہ تھا، اور پھر دو سرے لمبے کندھے کے سہارے بانس کے برابر ہاتھ جھول رہا تھا۔

اب میں خود کو بالکل ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں۔ بس کبھی کبھی ساری رگیں پھولنے لگتی ہیں۔ ہاتھ میں خارش ہوتی ہے اور منھ میں بہت سی رال بھر جاتی ہے۔ تب مجھے ذرا الجھن ہوتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ اس تھوک بھرے منھ کی پچکاری نرس کے گالوں پر چھوڑ دوں۔ مجھے اس نرس سے نفرت ہوتی جا رہی ہے۔ یہ روز وہی ایک دوا دیتی ہے جس کو کھانے کے بعد میرے ہاتھ کی نسیں پھیلنی شروع ہو جاتی ہیں۔ نیچے سے پھیلتی ہیں اور اوپر سے سکڑتی ہیں اور پورے جسم میں سوئیاں سی چبھتی ہیں۔ جیسے کوئی ڈنک مار رہا ہو۔ ایسی بے چینی اور ایسی گھبراہٹ ہوتی ہے کہ دل چاہتا ہے داہنے بازو کو کاٹ کر پھینک دوں۔ اگر میرا ہاتھ عام آدمیوں جیسا مر گلا ہاتھ ہوتا تو میں کبھی کا اس کو اپنے جسم سے الگ کر کے پھینک دیتا۔ مگر یہ تو عظیم ہاتھ ہے، بے گناہ ہاتھ جس نے ہندو یاتریوں... اور تم کہہ رہے ہو کہ ہاتھ کے آخری سرے پر جہاں بچھو سے چبھتے ہیں اور پلاسٹر کے اندر جو ابھار نظر آ رہے ہیں وہ انگلیاں ہیں۔

اس وقت بہت اندھیرا ہے کوئی چیز نظر نہیں آ رہی ہے۔ میں دیکھتا کہ یہ ابھری ہوئی چیز کیا ہے۔ اس اندھیرے میں تو مجھے، اپنا لمبا ہاتھ زرد اور کمزور سا دکھائی دے رہا ہے۔ دو بجے کی

ڈیوٹی پر نرس آئے گی۔ بجلی کا سوئچ دبا کر باری باری ہم سب کو دوا دے گی۔ اس وقت میں کمرے کی دیوار پر ہاتھ سے پرچھائیاں بنا کر دیکھوں گا۔ بچپن میں ہم ہاتھ کی انگلیوں سے دیوار پر ہاتھی گھوڑے بنایا کرتے تھے۔ اب تو یہ لمبا تڑنگا ہاتھ اس قدر وزنی ہے کہ بستر سے اٹھایا ہی نہیں جاسکتا۔ کل میرے ہاتھ کا پلاسٹر کھل جائے گا۔

اب نمبر تیس کی بتی روشن ہے۔ میرے سامنے والی دیوار پر دھیمی روشنی پڑ رہی ہے۔ یہ روشنی بالکل ٹھیک ہے۔ میں دیوار پر ہاتھی گھوڑے بنا کر اندازہ لگا سکتا ہوں۔ پھر نرس آ جائے گی اور گولی کھانے کے بعد تشنج شروع ہو جائے گا۔ یہ اس طرف... بالکل میرے سامنے والی دیوار پر کیا چیز ابھر رہی ہے۔ شاید انگلیوں کے ابھار ہیں اور یہ اب دیوار پر کیسے ہاتھی گھوڑے ایسے پھدک رہے ہیں۔ ایک، دو اور تین اور چار اور یہ انگوٹھا...؟ یہ سب سے الگ تھلگ... یہ انگوٹھا ہی تو ہے۔ نرس نے سخت پلاسٹر کے اندر جکڑ کر میرے ہاتھ کا حلیہ ہی بدل ڈالا۔ اس وقت میرا لمبا اور طاقتور ہاتھ زرد اور کمزور دکھائی دے رہا ہے۔ میں اب ایک مرتبہ پھر زینب کا گلا گھونٹ سکتا ہوں۔ رات کی رانی کا پودا اکھیڑ سکتا ہوں اور نرس کی ٹھوڑی کے نیچے چمکتے ہوئے تل کو چوم سکتا ہوں۔

میں اندھیرے میں اپنے بستر سے اٹھا، اپنے جوتے تلاش کیے اور نمبر تیس میں گھستا چلا گیا۔ خوبصورت چوٹی والی لڑکی کے سرھانے زینب کھڑی تھی۔ اس کا لمبا چوڑا سایہ کمرے کی دیوار پر پھیلا ہوا تھا۔ میں پھر جھپٹنے لگا۔ تب اس نے تھکی تھکی آنکھوں سے مجھے دیکھا اور بھنچے ہوئے ہونٹ کھولے ہی تھے کہ میں نے آگے بڑھ کر اس کا گلا دبا دیا اور پھر ٹھوڑی کے درمیان چمکتے ہوئے تل کو چوما۔ زینب چیخی۔ خوبصورت چوٹی والی کلثوم چیخی اور پھر سب اٹھ گئے۔ حواس باختہ سے اِدھر سے اُدھر بھاگنے لگے۔ میں تیزی سے کمرے سے نکلا اور دروازے کے ساتھ لگا ہوا رات کی رانی کا پودا اکھیڑتا ہوا کانٹوں والی باڑھ کو پھلانگ کر سڑک پر نکل آیا ہوں۔

لڑکے ''لکڑبھگا لکڑبھگا'' کہہ کر چلا رہے ہیں اور میں رات کی رانی کا پودا لیے کھڑا ہوں۔ زینب اور بسنتو کی قبر پہلے ہی خودرو پودوں اور کنیر کے پھولوں سے ڈھکی ہوئی ہے اور میں ہاتھ میں گناہ کا بوجھ اٹھائے کھڑا ہوں۔

الٹے پیروں والے

بندر کے ہاتھ میں ڈگڈگی تھی اور سارا مجمع ناچ رہا تھا۔

"استغفراللہ،" ایک بڑے میاں جو مجمع سے بے تعلق سے کھڑے تھے، انھوں نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھا اور بولے:

"یہ ناچنے کا کون سا موقع ہے؟ بندر کی ڈگڈگی پر پوری خلقت کو ناچتے ہم نے یہیں دیکھا ہے۔"

انھوں نے ذرا آگے بڑھ کر لوگوں کو مخاطب کیا:

"خدا کے بندو، کیوں چکر گھنی بن رہے ہو؟ بہتر ہوگا اگر تم لوگ اپنے گھروں میں بیٹھ کر سورۂ یوسف کا ورد کرو اور اس خواب کو دھیان میں رکھو کہ سات موٹی گائیں جن کو سات سوکھی گائیں کھا رہی ہیں۔ سات خوشے سبز ہیں اور سات خوشے خشک، اور کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔"

"جناب آپ شاید میرا مطلب ہے اس طرف..."

مجمے میں سے ایک ادھیڑ عمر کا شخص بڑے میاں کے پاس کھسک آیا اور اپنی مخملی ٹوپی کو ترچھا کرتے ہوئے دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔

"محض خرافات،" بڑے میاں نے اپنی ڈاڑھی پر ہاتھ پھیرا اور اچھلتے ہوئے مجمعے پر نظر ڈالی۔

"کس طرف کے ہیں؟" ایک اور شخص جو سرمئی شیروانی پہنے ہوئے تھا اس کے کان

کھڑے ہوئے۔ اس نے منھ میں دبے ہوئے پان کو الٹ پلٹ کرتے ہوئے پان کی پچکاری زمین پر ماری اور مخملی ٹوپی والے کے کان کے پاس منھ لے جا کر بولا:

"اندرونِ سندھ تیتر کے شکار پر بھی پابندی لگ گئی۔ خاں صاحب کی دونالی کا کیا بنے گا؟"

"ناچے گا، خاں صاحب ناچے گا۔ یہ مسخری کا وقت ہے۔ ناچنے کا ٹائم۔ بھائی تم لوگ ادھر کیا اپنی مسجد بناتا ہے! ادھر ہمارے ساتھ آ کر ناچو!" ناچتے ہوئے مجمع میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر بڑے میاں کا بازو کھینچا۔

"خبردار جو مجھے ہاتھ لگایا!" بڑے میاں غرائے۔

بندر زور زور سے ڈگڈگی بجا رہا تھا اور سارا مجمع ناچ رہا تھا۔ پیڑ کے نیچے مجمع نیم دائرے کی شکل میں جمع ہونا شروع ہوا تھا۔ ڈگڈگی کی آواز کے ساتھ گھروں سے عورتیں، مرد، بچے نکلنے شروع ہو گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے چوراہے پر بھیڑ لگ گئی۔

"شاید شہید کی برسی ہے،" لال ٹوپی والا بولا۔

"عقل ماری گئی ہے!" بڑے میاں خود ہی خود بڑبڑائے۔

وہ بدلتی ہوئی رُت کا وقت تھا جب دن بڑے ہونے شروع ہو جاتے تھے اور شام میں سوندھی مٹی کی مہک گھل جاتی تھی۔ اس وقت میٹھے پانی کے کنوئیں کے قریب نیم کے پیڑ کی چھاؤں میں بندر والا زور زور سے ڈگڈگی بجاتا اور سارے بچے گلی میں نکل آتے اور بندر کا تماشا شروع ہو جاتا۔

ڈگ ڈگ ڈگ ڈگ کرتا آیا

بندر والا بندر لایا

بندر کے ساتھ ایک بندریا

پہنے ہوئے ہے لال گھگھریا

جوں ہی بندر والا آیا

سب بچوں نے ٹھٹھا لگایا

لے کر ڈنڈا ر کھ کر جھولا

بندر والا ہنس کر بولا
ناچو بیٹا ناچو بیٹا
بندر نے بھی بدن سمیٹا
اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر
گردن اور کولھے مٹکا کر
جھجکا اور نہ کچھ شرمایا
تھرک تھرک کر ناچ دکھایا
دیکھو اب سسرال کو جانا
بیوی کو بھی ساتھ میں لانا
بیوی پہلے تو شرمائی
پھر وہ چھم چھم کرتی آئی
بچوں نے بندر کو ستایا
بندر کو بھی غصّہ آیا
جھپٹا ان پر ڈنڈا لے کر
ان کو ڈرایا بھبکی دے کر
کر کے تماشے ایسے ایسے
سب بچوں سے مانگے پیسے

کھیل اپنے عروج پر پہنچ کر ختم ہو جاتا تھا۔ بندر والا پیسے بٹور کر اپنی راہ لیتا۔ بچوں کی چھوٹی بڑی نگاہیں دور تک اس کے ساتھ جاتیں۔

''اور یہاں... لاحول ولاقوۃ...'' بڑے میاں نے اپنی آنکھوں کو بند کیا اور پھر کھولا۔

ڈگڈگی اب کسی علاقائی دُھن میں بج رہی تھی۔ مجمع ناچتے ناچتے بے حال ہو چکا تھا۔ عورتیں، مرد، بچے اور بوڑھے سب اپنے سروں کو پھینک پھینک کر اور بالوں کو جھٹک جھٹک کر ناچ رہے تھے۔ پیڑ کے نیچے کا میدان سیاہی مائل بھورا ہو چکا تھا۔ بندر خوش تھا۔ وہ کبھی اپنے پیر کو دیکھتا اور

کبھی ناچتے ہوئے لوگوں کے پیر۔ سب پیر ایک ہی انداز میں اٹھ رہے تھے ــ اُلٹے پلٹے۔

"میاں جی، تم بھی ٹھمکا لگاؤ!" ناچتے ہوئے مجمعے میں سے ایک اور شخص نے بڑے میاں کے کرتے کا کونا گھسیٹا۔

"خبردار، اپنے ہوش میں رہو!" بڑے میاں نے نوجوان کو جھڑکا اور اپنی جگہ پر کچھ اور جم کر کھڑے ہو گئے۔

"ہم سب بڑی تیزی سے پلٹ رہے ہیں،" ناچتے ہوئے مجمعے میں سے ایک اور شخص بولا۔ اس نے آنکھوں پر موٹے فریم کا چشمہ لگایا ہوا تھا۔ صورت شکل اور اپنے حلیے سے کوئی فلسفی دکھائی دیتا تھا۔

"تمھیں اپنی جڑوں کی تلاش ہے؟" فلسفی نے بڑے میاں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا اور پھر کسی دانشور کی نقل اتارتے ہوئے منہ کو ٹیڑھا کر کے کہا:

"ناحق تم اپنی صلیبیں اپنے کندھے پر اٹھائے ہوئے ہو۔ حالاں کہ سب کو معلوم ہے کہ تمھارے خیالات بانجھ ہو چکے ہیں۔"

نوجوان نے چشمے کے اندر سے بڑے میاں کو گھورا جو ہونقوں کی طرح منہ کھولے کھڑے تھے۔ ان کے چہرے اور انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ انھوں نے نوجوان کی کوئی بات نہیں سنی۔ ہیجانی انداز میں ناچتے ہوئے گروہ کو دیکھ کر وہ سرد آہ بھر کر شیروانی والے سے مخاطب ہوئے جو ان کے برابر ہی کھڑا تھا اور منہ میں دبے ہوئے پان کی پیک سے دیوار پر گلکاری کر رہا تھا۔

"میاں میں تو بس ان سب سے ایک ہی بات کہتا ہوں کہ وہاں تو..."

"بولتے کیوں نہیں، آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟" چشمے والا نوجوان ناچتے ہوئے بولا۔

"ہم وقت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے ہیں۔ ہمارا مشن طاؤس و رباب اول، شمشیر و سناں آخر ہے۔ چلے آئے رنگ میں بھنگ ڈالنے مجذوب میاں،" فلسفی غرّایا۔

"شکل سے جاسوس دکھائی دیتا ہے،" شیروانی والا بولا۔

"بھائی یہ سب اس دانے کا کرشمہ ہے۔ امریکی گندم کھا کر انسان یوں ہی اُچھلنے لگتا ہے۔ دیکھ نہیں رہے اس قوم کو، آسمان پر تھگلی لگا دی،" لال مخملی ٹوپی والے نے کہا۔

"اور وہ بحری بیڑا ذری ہوائی۔ دوسروں پر تکیہ کرنے کا حشر دیکھ لیا۔ اتنا سب کچھ کھو کر بھی عقل نہیں آئی۔ خدا معلوم یہ کس بات کا جشن منارہے ہیں۔ ناعاقبت اندیش کہیں کے! سارے جذبے ہی سرد پڑ گئے۔" بڑے میاں نے سرد آہ بھری اور کھڑے کھڑے بہت دور پہنچ گئے۔

[وہاں جہاں آہنی کٹہروں کے پیچھے نوے ہزار قیدی امید و بیم میں دن گزار رہے تھے۔ ذلت اور رسوائی کا داغ اپنے سینے پر لیے وہ کبھی اپنی تنی ہوئی چھاتیوں کو دیکھتے تھے کبھی ہاتھوں کو اور کبھی پیروں کو۔]

"نٹ کا تماشا موسم کے بدلنے کے ساتھ زور پکڑتا تھا۔ کنکوے اور پتنگ بازی کے مقابلے۔ مانجھے سرسوں پھولنے کے ساتھ ساتھ سُتنے شروع ہو جاتے تھے۔ جیسے ہی دن میں پھولی ہوئی سرسوں کی پیلاہٹ گھلنی شروع ہوتی دکان دار آٹے کی لگدی پکا کر مانجھے سُوتنے شروع کر دیتے۔ گیس کی لالٹینوں کی روشنی میں سڑک کے کنارے مانجھے سوتنے والے لڑکے کمر سے کمر ملا کر بیٹھ جاتے اور پھر ساری رات لطیفے بازی ہوتی۔ کوٹھوں اور چھجوں پر سے "ظاہر دار بیگ" اترنے شروع ہوتے۔ کڑھے ہوئے کرتے، دوپلی ٹوپیاں، ہاتھوں میں جوہی اور مولسری کے گجرے۔ منہ میں خوشبودار قوام کی گلوریاں۔ خراماں خراماں معطر معطر، نسیم آرہی ہے کہ وہ آرہے ہیں، کوٹھے سے آوازیں آتیں۔ اور ادھر تو نرے لال بیگ ہیں،" بڑے میاں نے سوچا۔

"یہ قبر تک ساتھ جائیں گے،" شیروانی والے نے کہا۔

"وقت وقت کی بات ہے۔"

"تم کس وقت کی بات کرتا ہے؟" مجمعے میں سے ایک پگڑی باندھے ہوئے آدمی نے آواز لگائی۔

"بھائی تم ناچتا کیوں نہیں؟" اس آدمی نے ٹوپی والے سے پوچھا۔

"ناچ کے لیے رنڈی کا کوٹھا ہے۔ اجی ناچ بھی بس دیکھ لیا۔ گیا دورِ سرمایہ داری گیا،" ٹوپی والے نے سرد آہ بھری۔

"یہ بھی کوئی بات ہوئی، سب بندر ہی بن بیٹھے،" بڑے میاں نے پھر ناچتے ہوئے مجمعے کو بھرپور نظروں سے دیکھا اور بڑبڑائے۔

"میاں جی دیکھتے جاؤ- وہ وقت بھی دور نہیں جب یہ ساری خلقت اپنے پیروں میں لمبے لمبے بانس باندھے تاروں پر قلابازیاں کھاتی ہوئی نظر آئے گی- ہم تو بس اپنی اپنی بولیاں بول کر اُڑ جائیں گے،" شیروانی والے نے کہا-

"اگر ایسا وقت آنے والا ہے تو خداوند تو اس سے پہلے میرا پردہ ڈھک لے-" بڑے میاں کے قریب ہی ایک ادھیڑ عمر کی عورت آ کر کھڑی ہو گئی تھیں- انھوں نے کالا برقع پہن رکھا تھا جس کے سر والے حصے پر تیل کا چیکٹ جما ہوا تھا- لٹھے کا غرارہ جو برقعے سے باہر نکلا ہوا تھا اس کی گوٹ مٹی میں لتھڑی ہوئی تھی- وہ جلدی جلدی اپنے جبڑوں کو حرکت دے رہی تھیں اور تیز تیز بول رہی تھیں-

"آپ بھی شاید..." شیروانی والے نے خاتون کا اوپر سے نیچے تک جائزہ لیا اور جب یہ اطمینان ہو گیا کہ یہ بھی کوئی غدر کی ماری ہوئی شہزادی ہیں تو وہ ان کے برابر کھسک آیا اور بولا:
"آپ کے پاس پان ہو گا؟"

"پان کہاں رکھا ہے! جنگ نہ جنگ کی گت- پندرہ دن کی اس طمنچے بازی نے یہ غضب ڈھایا کہ پاندان پر ہی جھاڑو پھر گئی- ان سلاد کے پتوں نے تو میرا پیٹ ہی خراب کر دیا- ہر وقت ریاح بھرے رہتے ہیں- اور میرے میاں کو تو رات سے جلاب لگے ہیں- مار سلاد کی گڈیاں کی گڈیاں بھکس گئے- اور سنو اب ہم سے ہی پوچھتی ہے- پاکستان کی بکریاں کیا چر رہی ہیں- ذرا میرے سامنے آ کر پوچھے- قطامہ کی زبان نہ کھینچ لوں! چر رہی ہیں تیرا کلیجا!" خاتون نے تیز تیز بولتے ہوئے کہا-

"آخ خاہ، آپ بنیادی بیگم پان والی ہیں،" ٹوپی والے نے ان کو پہچانتے ہوئے کہا- "آپ کا کاروبار تو اب ختم ہی سمجھو- پان آنا بالکل بند ہو گیا-"

"قالین بافی شروع کر دی ہے،" سوکھی چھالیہ کا پھنکا لگانے کے بعد وہ اکڑ کر بولیں- "کئی قسم کے قالین بننے میں میرے میاں کو کمال حاصل ہے،" انھوں نے فخر سے کہا-

"پھر کیوں اب تک پان بیچ بیچ کر اپنی اوقات گنوا رہے تھے؟" ٹوپی والے نے کہا-

"واہ! اوقات گنوانے کی بھی تم نے اچھی کہی- یہ تو ہمارا آبائی پیشہ ہے- میاں کے بزرگ

شاہانِ اودھ کی گلوریاں بنانے پر مامور تھے۔ ان گلوریوں کا جواب نہیں تھا۔ ایک سائز اور ایک وزن کی گلوریاں! چھ چھ گلوریاں تو ایک ساتھ صاحب زادیاں منھ میں رکھ کر شہد کے گھونٹ کی طرح پی جاتی تھیں۔ شہزادے پیک کی پچکاریاں لونڈیوں باندیوں کی تنی ہوئی چھاتیوں پر مارتے تھے۔ ان سے بھی دنوں خوشبو کے بھبکے اٹھتے رہتے تھے۔ پان کا اور ہمارا ساتھ صدیوں پرانا ہے۔ یہ چُھوٹا تو سمجھو دنیا چھوٹی۔ اور اب زندگی میں رہ بھی کیا گیا ہے۔ نہ کوئی رنگ نہ خوشبو۔ لٹھے میں لپٹی ہوئی ایک سرد اور بےجان لاش۔" خاتون نے نقاب اٹھا کر گردو نواح کا جائزہ لیا۔ شیروانی والا ان کے بالکل قریب کھسک آیا تھا۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا:

"آپ کو اس عینک کا علم ہے؟"

"حبیب اللہ کے چشمے کو پوچھو ہو۔ توبہ توبہ!" انھوں نے نقاب چہرے پر ڈال کر اپنے دونوں گالوں کو پیٹ ڈالا۔

"کیا چشمے سے آرپار... اندر سے لے کر باہر تک؟" محترمہ نے بوکھلاتے ہوئے پوچھا۔

"اجی خالہ سب کچھ، بھیتر اندر۔ ایک دم مادرزاد..."

"تم میں سے کسی نے لگا کر دیکھا ہے؟" عورت نے بیک وقت سب سے پوچھا۔

"توبہ کریں جی۔ وہ نابنجار حبیب اللہ لگائے لگائے شہر میں گشت کرتا پھرتا ہے۔ کم بخت بڑھتا بھی لڑکیوں کے ساتھ ہے۔ اب ماں بہنوں کی عزت بھی محفوظ نہیں،" بڑے میاں نے کہا۔

"ہے ہے!" محترمہ نے گھبرا کر برقع کو اپنے گرد لپیٹا۔ اپنے جسم کو اچھی طرح چھپا کر وہ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے گلی میں چلی گئیں۔

بندر بدستور ڈگڈگی بجا رہا تھا اور مجمع بدستور ناچ رہا تھا۔ بڑے میاں کے چہرے پر سوچ کی گہری لکیریں ابھر آئی تھیں۔ وہ کبھی ناچتے ہوئے مجمعے کو دیکھتے اور کبھی آسمان کو۔ صاف شفاف آسمان پر دور دور تک کوئی پرندہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

"آپ پتھر برسانے والی ابابیلوں کے منتظر ہیں، کسی معجزے کے؟ حد ہے رجعت پسندی کی!" فلسفی نے اپنے چشمے کے شیشوں میں سے بڑے میاں کو گھورا۔

"وہی چشمہ! دھویں کے رنگ کے دھندلے شیشوں والا۔ خالص بدیسی مال!" شیروانی والے

نے چونک کر فلسفی کو دیکھا۔

"اور خیالات بھی!" ٹوپی والے نے کہا۔

"خیالات کا بھی سودا ہوتا ہے۔ تف ہے ہمارے حال پر۔ بندر کے اشاروں پر ناچنے کا انجام آپ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔" گلی کے گھر میں سے ایک اور صاحب نکلے۔ انھوں نے کلی والا کرتا اور تنگ مہری کا پاجامہ پہن رکھا تھا۔

"جو کچھ خدا دکھائے سو ناچار دیکھنا۔"

"کیوں صاحب، دیکھنا نہ دیکھنا اپنے اختیار کی بات ہے۔ آپ گھنٹے بھر سے ادھر کھڑے ہیں۔ لاحول بھیج کر چلے کیوں نہیں جاتے؟" نووارد نے بڑے میاں سے کہا۔

"میں ان لوگوں سے ایک بات کہنے آیا تھا۔ یہ کہ بھلے لوگو گھروں میں بیٹھ کر سورۂ یوسف کا ورد کرو اور اس خواب کو ذہن میں رکھو کہ سات موٹی گائیں جن کو سات سوکھی گائیں کھا رہی ہیں۔ سات خوشے سبز ہیں اور سات خوشے خشک۔ اور کچھ شک نہیں کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔"

"آپ بھی پتھر میں جونک لگانے چلے ہیں۔ تضیعِ اوقات سے فائدہ۔ میں تو سبزی خریدنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ پتا چلا بشیر سبزی فروش دکان بند کر کے صبح سے ادھر ہی کولھے مٹکا رہا ہے۔ میری بیگم کو دلما پکانے کے لیے دیسی ٹنڈوں اور کچی امبیا کی ضرورت ہے،" نووارد نے کہا۔

"بیگم بھی بڑی ناعاقبت اندیش ہیں۔ بھلا یہ دلمے اور قلیے کا وقت ہے؟ سارا ملک کڑھائی مرغی اور بالٹی گوشت کا دیوانہ ہے اور ان کو دیسی ٹنڈوں کی تلاش ہے۔ آثارِ قدیمہ۔ بڑے میاں تو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ!" فلسفی جھلایا۔

شیروانی والا بھی دل ہی دل میں بیگم کی عقل پر کفِ افسوس ملتا ہوا بڑے میاں کے ذرا اور قریب آ گیا اور ان کے کان کے پاس منھ لے جا کر بولا:

"حضور، آپ اپنی راہ لیجیے۔ خدا دوزخیوں کی یوں ہی رسی دراز کرتا ہے۔ ہم آپ تو نہیں ہوں گے مگر میری بات لکھ لیجیے، یہ صدیوں تک یوں ہی ناچتے رہیں گے۔ بندر ان کو گھن چکر بنا کر دم لے گا۔"

"مجھے بھی یہی غم ہے،" بڑے میاں نے افسردگی سے کہا۔
"قاضی جی، تم کائے کو دبلا ہوتا ہے؟" پگڑی والے نے دائرے میں سے ہی آواز لگائی اور بڑے میاں کو اشارے سے بلانے لگا۔ بڑے میاں نے اپنا منھ دوسری طرف پھیر لیا۔ اب وہ سڑک کو گھور رہے تھے۔ خاموش سڑک پر ان کو ساری مخلوق ناچتی ہوئی نظر آرہی تھی۔ زور زور سے اُچھلتی ہوئی یہ مخلوق کسی علاقائی دھن پر اپنے جسم کو زور زور سے ہلا رہی تھی جیسے اچھلتے ہوئے آسمان پر جا پہنچے گی۔

"خداوند، تو ہی راہ راست دکھا ان کو!" بڑے میاں نے آستین کے دامن سے آنکھوں کو پونچھا اور قدرے آگے بڑھ گئے۔ اب وہ ناچتے ہوئے گروہ سے کافی فاصلے پر کھڑے تھے۔ تن تنہا ....ایک ٹھنٹھ کی طرح...

گھروں سے لوگ جوق در جوق نکل رہے تھے اور آواز کی طرف دوڑ رہے تھے۔ مجمع بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔ ڈگڈگی مستقل بج رہی تھی۔ بڑے میاں نے اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اب ان کے قریب نہ ٹوپی والا تھا اور نہ شیروانی والا۔ دیسی ٹنڈوں کی تلاش میں جو صاحب نکلے تھے وہ ناچنے والے گروہ میں شامل ہو چکے تھے۔ وہ اس گروہ میں شامل ہو کر بشیر سبزی فروش کو تلاش کر رہے تھے۔ ان کی بیگم کو دوپہر کے کھانے کے لیے دلما پکانا تھا۔
"بھائی تم بھی کیا بات کرتا ہے۔ آج کے دن بشیر سبزی فروش کو تلاش کرتا ہے۔ تم بالٹی گوشت کیوں نہیں کھاتا۔ بےفکری سے ناچو!" لوگوں نے ان کو چکر دیتے ہوئے کہا، اور وہ بھی اُچھل کر ناچنے لگے۔

"لاحول ولا قوۃ!" بڑے میاں نے بےاعتباری سے اپنی آنکھوں کو مسلا اور پھر اپنے دائیں بائیں دیکھا۔ شیروانی والا اور ٹوپی والا بھی ان کے پاس کھسک آئے تھے۔
"وہ بھی گئے..." بڑے میاں نے گہرا سانس لیا۔
"وہ کدھر جا سکتے ہیں؟" انھوں نے خود سے پوچھا۔ اپنے ارد گرد کو ٹٹولا۔ سڑک کو گھورا۔ بجری پڑی ہوئی لمبی سڑک، پیڑ کے نیچے اُچھلتی ہوئی خلقت، بندر اور ڈگڈگی اور ایک جانی پہچانی علاقائی دھن اور اُدھر کونے میں دیوار کا سہارا لیے ہوئے دبکا سمٹا ایک تنہا انسان۔ بڑے میاں کو اپنا

حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا۔

انھوں نے پھر شیروانی والے اور ٹوپی والے کو ڈھونڈا۔ اور ایک بار پھر ناچتے ہوئے مجمع پر نظر ڈالی اور وہ بھونچکا ہو کر رہ گئے۔ ٹوپی والا اپنے منھ پر ٹوپی رکھے ناچ رہا تھا۔ اس کے پیچھے شیروانی والا تھا۔ اس کی شیروانی کے بٹن کھل چکے تھے اور شیروانی کے اندر سے اس کا ملگجا کڑھا ہوا کرتا نظر آ رہا تھا۔

''لعنت ہے تم پر!'' بڑے میاں نے جھلّاتے ہوئے کہا اور دیوار سے ذرا اور دور ہٹ گئے۔ آوازیں اب بھی آ رہی تھیں لیکن ان کے کان سن اور زبان گنگ ہو گئی تھی۔ دیوار کا سہارا لیے وہ تنہا کھڑے ہوئے تھے۔ کبھی بے چارگی سے ناچتے، کودتے، اُچھلتے اور خوش ہوتے ہوئے مجمعے کو دیکھتے اور کبھی خود کو۔ اتنے اکیلے تو وہ کبھی بھی نہیں تھے۔ گھر والے سب ختم ہو گئے تو کیا ہوا۔ مانوس آوازیں اور خوش گوار یادیں تو تھیں...

آم کے پیڑ پر بور، کوئل کی کوک، نیم کے درخت سے گرتی ہوئی کچی پکی نمبولیاں۔ بارش کی پھوار، کڑھائیاں، جھولے اور دھانی دوپٹے۔ ''جھکی آئی رے بدریا ساون کی۔'' انھوں نے ذہن پر زور ڈالا۔ پر ہر آواز ان کا ساتھ چھوڑتی ہوئی سی محسوس ہو رہی تھی۔ اور یادیں... اب انھیں کچھ یاد نہیں تھا۔ ان کو اپنا ذہن ماؤف ہوتا ہوا لگا۔ ان کے سامنے تو بس بندر تھا جس کے اشارے پر ایک خلقت ناچ رہی تھی۔ بڑے میاں نے اس مرتبہ غور سے ناچتی ہوئی مخلوق کو دیکھا۔ اس میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ تنی چھاتیاں اور سڈول سڈول لباسوں میں چھپا ہوا ان کا جسم سارا کا سارا ہیجانی انداز میں تھرک رہا تھا۔ بڑے پُراسرار انداز میں وہ جسم کو بل دیتی ہوئی اپنے ہم رقص مردوں کی کمر میں ہاتھ ڈالے جھول رہی تھی۔ بڑے میاں کو پھریری سی آئی۔ اسی لمحے ان کی نظر اپنے قریب ہی اچھلتی ہوئی عورت پر پڑی۔ اس کے ڈھیلے ڈھالے سواتی کرتے کے اندر کوئی چیز چھلانگیں سی لگا رہی تھی۔ بڑے میاں کی آنکھیں پھٹنی شروع ہوئیں۔ پیشانی کے اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں ابل کر ساری کی ساری باہر آ گئیں۔ جسم کے اندر کوئی چیز آہستہ آہستہ پگھلتی ہوئی سی محسوس ہوئی۔ ان کے سامنے گداز اور صحت مند پنڈلیاں حرکت کر رہی تھیں۔ عریاں اور نیم عریاں جسم ڈگڈگی کی تال پر جھوم رہے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے بڑے میاں کی چندھی آنکھوں میں بہت سے رنگ بھر

گئے۔ عورت کے سواتی کام کے کرتے کے اندر پھر کوئی چیز اُچھلی۔ بڑے میاں کے چلتے ہوے قدم ایک دم رک گئے۔ انھوں نے دیوار کا سہارا لیا۔ لمحے بھر کو وہ ٹھہرے۔ انھیں نہیں معلوم کہ وہ کب چلے، کیسے چلے اور کب چلتے ہوے ناچتے ہوے گروہ میں شامل ہو گئے۔

فلسفی نے دیکھا اب بڑے میاں سواتی کرتے والی کی کمر سے کمر ملائے ناچ رہے تھے اور اونچے اونچے قہقہے لگا رہے تھے۔ ناچتے ناچتے انھوں نے فلسفی کے کان کے پاس منھ لے جا کر کہا:

"اجی چھوڑیں جی، وہاں کا کیا ذکر، وہاں تو بس بندر ناچتا تھا..."

پانی! پانی!

غزالہ کا فلیٹ عمارت کی داہنی طرف تھا۔ اس کا شوہر ارشاد احمد ایک بحری مرچنٹ جہاز میں ملازم تھا۔ شہر میں آئے دن کی ہنگامہ آرائی اور اس کے نتیجے میں کرفیو کی پابندیوں سے پریشان ہو کر اس کے خاندان (وہ، اس کی بیوی غزالہ اور اس کی ماں) نے شہر کے شمالی حصّے سے نقل مکانی کر کے جنوب میں ایک کرائے کے فلیٹ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔

لاتعداد فلیٹوں کا سلسلہ شہر کے جنوب میں دور تک پھیلا ہوا تھا۔ جہاں ساحل، سمندر کی لہروں کو روکنے کے ساتھ ساتھ اہالیانِ شہر کی سیر و تفریح کا موقع بھی فراہم کرتا تھا۔

فلیٹ کے باہر سورج بہت شدت سے نکل آیا تھا اور تمازت بڑھ گئی تھی۔ فلیٹ کے اندر گرمی نہیں تھی اور ماحول پُرسکون تھا۔ غزالہ نے ابھی تک اپنا بستر نہیں چھوڑا تھا۔ اس کے ذہن پر وہ سب کام سوار تھے جن کا تعلق پانی سے تھا۔ کھانے کے گندے برتن اور دیگچیاں جن پر جمے ہوئے گھی کی تہیں چڑھی ہوئی تھیں اور جن کی صفائی کے لیے پانی کی کئی بالٹیاں درکار تھیں۔ گھر پر دھلنے والے میلے کپڑے، بنیان، رومال، کرتے، دوپٹے اور جھاڑن... واش بیسن، سنک اور گٹر کے نیچے سے صفائی... دن بھر پینے کے لیے پانی کا ابالنا، وضو، غسل، آب دست اور دیگر اقسام کی صفائی ستھرائی... یہ اور ان گنت کام اور پانی کا کال...

غزالہ کو اپنا بستر چھوڑنے کے لیے کوئی ترغیب نظر نہیں آئی۔ اس نے لیٹے ہی لیٹے اپنی کھڑکی سے بائیں طرف کے فلیٹ پر نظر ڈالی۔ بالکونی پر دھلے ہوئے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔

بیرونی ممالک سے آئے ہوئے شب خوابی کے لباس، لیس کے محرم، سلک کے زیرجامے، رومال، مردانے اور زنانے کپڑوں سے پوری الگنی بھری ہوئی تھی۔ فلیٹ میں کام کرنے والا نوجوان ملازم جو اچھے تن و توش کا مالک تھا، بڑے پھرتیلے انداز میں کام کر رہا تھا۔ ملازم لڑکا ان کپڑوں کو الگنی پر ڈالتے ہوئے مسکرا بھی رہا تھا۔ وہ کبھی کپڑوں کی گولائیوں پر غور کرتا اور کبھی ان کی نرمی اور گرمی کو محسوس کرنے کے لیے ان کو اپنے گالوں اور ہونٹوں سے مس کرتا۔ ایسا کرتے ہوئے وہ بار بار باہر دیکھتا تھا، کہیں کوئی دیکھ نہ لے۔ کہیں اس کی چوری پکڑی نہ جائے۔ وہ عمر کے جس حصے میں تھا اس میں چونکنے اور چونکا دینے کے عمل کو بہت دخل تھا۔ گھر کی مالکن جو ایک نوجوان اور خوش شکل عورت تھیں، بالکونی میں نکل آئیں۔ انھوں نے خوش رنگ تولیے سے اپنے سر کے گیلے بالوں کو لپیٹا ہوا تھا۔ تولیے کے اندر ہی اندر انھوں نے اپنے بالوں کو مروڑی سی دی۔ بہت سا پانی زمین پر گر پڑا۔ یہ اطمینان کرنے کے بعد کہ بالوں سے فاضل پانی نکل چکا ہے وہ اپنے بالوں میں کنگھی کرنے لگیں۔

دوسرے کمرے میں غزالہ کی ساس جو نابینا اور دمے کی مریضہ تھیں اپنے پلنگ پر لیٹی تھیں اور برابر بول رہی تھیں:

"گھر کا فرش دھو لو۔ جمعرات ہے۔ دو بالٹی نہانے کے لیے، ایک بالٹی طہارت کی، تین لوٹے کلّے کے۔" پانی کی بالٹیوں کا حساب لگاتے ہوئے وہ گنتی بھول گئیں اور سارے لوٹے اور بالٹیاں آپس میں گڈمڈ ہو گئیں۔ انھوں نے بہ دقّت تمام اپنا سر تکیے سے اٹھایا اور پھر زور زور سے اپنی ایڑیاں پلنگ کی پٹّی پر رگڑنے لگیں اور بڑبڑائیں:

"بے آب و گیاہ وادی، پہاڑیوں کے درمیان دوڑتی ہوئی عورت، پتھریلی زمین پر ایڑیاں رگڑتا ہوا بچہ... گھر کا فرش دھولو... احمد اب آتا ہوگا۔"

بستر پر پڑی ہوئی یہ خاتون صرف احمد اور "زم زم" کے انتظار میں زندہ تھیں۔

غزالہ کے کمرے میں کیل پر ارشاد کی قمیص ٹنگی ہوئی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ اب بستر سے اٹھ ہی جائے اور کیل پر سے قمیص اتار کر ان کو دے دے کہ اس کو آنکھوں پر ڈال لیجیے، بینا ہو جائیں گی۔ صاف ستھری قمیص پر خون کا کوئی دھبّا نہیں تھا۔ ارشاد احمد کو بھیڑیے نے کھایا ہی

کب تھا۔ اس وقت تو انسان ہی بھیڑیے ہو گئے تھے۔

لوگ کہتے ہیں وہ عجیب وقت تھا، اور لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ وقت انسان کا اپنا لایا ہوا تھا۔ ان ہی لوگوں میں سے کچھ لوگ آسمان پر آنکھیں لگائے بیٹھے تھے اور ان ہی لوگوں نے گھوڑوں پر سبز پوش سوار دیکھے تھے، مگر ان کے سروں پر عمامے نہیں تھے اور کچھ لوگوں نے ویرانوں میں اللہ ہو اللہ ہو کی آوازیں بھی سنی تھیں پر وہ آوازیں سالم نہیں تھیں۔ لوگ کہتے ہیں وہ عجیب وقت تھا۔ بوڑھی نابینا آنکھیں ویرانوں میں بھٹک رہی تھیں۔ حکیم بینا جو جنگلی جڑی بوٹیوں کی تلاش میں اس طرف آیا ہوا تھا اس نے لوگوں سے کہا: "زمین میں اپنی نیکیاں بو دو!"

سب نے ایک دوسرے کو دیکھا اور یوں ہی گم سم کھڑے رہے۔ تب ان ہی لوگوں میں سے ایک بولا: "یہ بائیں طرف والے ہیں!"

"بائیں طرف والے؟ ان کی بد نصیبی کا کیا پوچھنا!" وہ بڑبڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

کمرے میں بڑھتی ہوئی روشنی دیکھ کر غزالہ اپنے بستر سے اٹھی اور باری باری سب نلوں کو کھولتی ہوئی باورچی خانے میں آ گئی۔ وہاں کا نل پہلے سے ہی کھلا ہوا تھا اور پانی کے قطرے گندے برتنوں میں ٹپک رہے تھے۔ اس نے خالی بالٹی نل کے نیچے سرکا دی اور خود بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

سامنے سمندر پھیلا ہوا تھا۔ لوگ ہواخوری کے لیے جا رہے تھے۔ دور تک عمارتیں ہی عمارتیں پھیلی ہوئی تھیں۔ شہر چاروں طرف سے پھیل رہا تھا۔ انسان اس شہر میں ریوڑ کی طرح داخل ہو رہے ہیں۔ صنعتوں، کارخانوں، ہسپتالوں، ہوٹلوں، دکانوں، فلیٹوں، سب کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ سبزہ، لان، باغات، درخت سب سوکھ رہے تھے۔ شہر کی اعلیٰ ترین سوسائٹیاں بھی ٹینکروں کی محتاج تھیں۔ شہر میں ٹینکر مافیا کا دوردورہ تھا۔ پانی چرایا جا رہا تھا۔ پانی بک رہا تھا۔ بوند بوند پانی کی قیمت دینی پڑ رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شہر میں پانی کا قطرہ بھی نہیں ہے۔

"اس بڑھتے ہوئے بے ہنگم شہر کی پیاس بجھاتے بجھاتے دریائے سندھ اور حب ڈیم ہی خشک نہ ہو جائیں!"

اتنے میں پانی کی زنگ خوردہ ٹنکی اپنی گاڑی پر لگائے گدھے گاڑی والا سڑک پر نظر آیا۔

"آدھی ٹنکی خرید کر آج کا کام ختم کیا جائے۔" غزالہ نے دونوں ہاتھوں میں خالی بالٹیاں اٹھائیں اور اپنے فلیٹ سے اتر کر نیچے آ کر کھڑی ہو گئی۔

"پانی سے بھری ہوئی بالٹیوں کو اٹھا کر اوپر لے جانا بھی ایک مسئلہ ہے۔" اس نے ہمت کر کے بالٹیوں کو اٹھایا اور اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔ پانی ہر سیڑھی پر بالٹی سے چھلکنے لگا اور غزالہ کے دل کے اندر ایک گڑھا سا بنتا چلا گیا۔ وہ اس سارے گرتے چھلکتے پانی کو اونٹ کی طرح اپنے اندر جمع کرنے کی بے پناہ خواہش لیے ہوئے اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"تین لوٹے کلّے کے، ایک بالٹی طہارت کی،" اندر کمرے میں بوڑھی عورت حساب لگا رہی تھیں۔

باہر سڑک سے فقیر کی آواز آ رہی تھی:

"جمعرات بھری مراد۔" بوڑھی عورت کے کان اس آواز پر کھڑے ہو جاتے اور وہ چونکتیں۔

"اماں اگر نابینا ہونے کے ساتھ قوتِ سماعت سے محروم ہوتیں تو زندگی گزارنا کچھ آسان ہو جاتا۔"

باورچی خانے میں بالٹیوں کو رکھ کر وہ پھر بالکونی میں آ کر کھڑی ہو گئی۔

سامنے سرخ اینٹوں والے دو منزلہ مکان کے لان میں بنی ہوئی مصنوعی پہاڑیوں سے پانی آبشار کی صورت میں گر رہا تھا۔ بائیں طرف فلیٹوں کی سب ٹنکیاں بھر گئیں اور فالتو پانی زمین پر بہنے لگا۔ الگنیاں دھلے ہوئے کپڑوں سے بھرنی شروع ہو گئیں۔ برتنوں کے دھلنے کا شور اور کھانا پکنے کی آوازیں اور خوشبوئیں چاروں طرف سے غزالہ کے کانوں اور نتھنوں میں گھسنے لگیں۔ وہ بالکونی سے ہٹ کر کمرے میں آ گئی اور اپنا صندوق کھول کر بیٹھ گئی۔

صندوق میں اس کے سارے شب خوابی کے لباس تہ کیے ہوئے رکھے تھے۔ اس کی زندگی میں دھلے دھلائے رات دن کم ہی آئے تھے۔ شادی کے بعد ارشاد احمد نے اس کو بتایا تھا: "فلیٹ میں شفٹ ہو جائیں گے۔ بس ذرا پانی کا مسئلہ ہے۔"

دو سال یوں ہی پانی پانی کرتے گزر گئے۔ کبھی مین پائپ لائن کو اونچا کروایا گیا اور کبھی نیچا۔ بار بار ہائیڈرینٹ کے چکروں، واٹر بورڈ والوں کی خوشامدوں، لائن مین کی منّتوں، ٹینکر کے لیے

دن دن بھر قطار میں کھڑے رہنے، پرچی بنوانے میں ارشاد احمد کی سب چھٹیاں ختم ہو گئیں اور وہ اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا۔

شادی کے صرف ڈھائی سال بعد شہر میں ہونے والے ہنگاموں میں اپنی زندگی ختم کرنے کے بعد ارشاد احمد نے غزالہ کو "شہید کی بیوہ" کا اعزاز دے کر ان تمام مسائل سے جلد ہی چھٹکارا حاصل کر لیا۔

عمارت کے بائیں طرف پانی آتا رہا اور بہتا رہا۔ غزالہ روز صبح اٹھ کر کپڑوں سے بھری ہوئی الگنیوں کو دیکھا کرتی۔ بیگم برنی کی الگنی اور ملازم لڑکے کی تیزی پھرتی دیکھ کر اس کے اپنے اندر کوئی چیز بہنے سی لگی۔ کچھ درد سا اس نے اپنے رگ پٹھوں میں محسوس کیا۔ وہ باہر سے اندر آ گئی اور نلوں سے پانی جمع کرتے ہوئے اس نے سوچا کہ وہ ذخیرہ جمع کرنے والی والی چیونٹی بنتی جا رہی ہے۔ جمعرات اس کے سر پر تلوار کی طرح لٹکتی رہتی تھی۔

جمعرات کو بوڑھی خاتون غسل کرتی تھیں۔ دنوں کا حساب وہ پلنگ پر لیٹے لیٹے لگاتی تھیں۔

"اماں کو نہلانا بھی اچھا خاصا مسئلہ ہے۔" اس نے غسل خانے میں ایک عدد پانی سے بھری ہوئی بالٹی کو دیکھ کر بدھ کو ہی جمعرات کا اعلان کر دیا۔

"اماں نہا لیجیے۔ آج جمعرات ہے۔" جھوٹ بولتے ہوئے اس نے کوئی خفت محسوس نہیں کی۔

غزالہ کا سہارا لے کر بوڑھی عورت غسل خانے میں داخل ہوئیں۔ ہاتھوں سے انھوں نے ان بالٹیوں کو ٹٹولا۔ تین خالی بالٹیاں برابر برابر پٹڑے پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کے ساتھ ہی وضو اور کلمے کے خالی لوٹے رکھے تھے۔ وہ انگلیوں سے گنتی کرنے کے بعد نہانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ غزالہ نے ان کے جسم پر پانی ڈالا۔ پانی ڈالتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپے اور تھوڑا سا پانی فرش پر گر پڑا۔ پانی کے زیاں پر وہ بوکھلائی اور بالٹی کے اندر جھانکا۔ پیندے میں تھوڑا سا پانی باقی رہ گیا تھا۔ دونوں ہاتھوں سے بالٹی کو اٹھا کو اس نے سارا پانی بوڑھی عورت کے جسم پر انڈیل دیا اور کلمۂ شہادت پڑھ کر ان کو پھر سہارا دے کر واپس کمرے میں بٹھا دیا۔ یہ سب کام غزالہ نے اس قدر پھرتی سے کیا کہ بزرگ خاتون سب پاکی ناپاکی، طہارت اور غلاظت بھول کر کلمہ پڑھتی ہوئی

کپڑے تبدیل کرنے میں مشغول ہو گئیں۔ ایک بالٹی پانی سے بوڑھی عورت کے غسل کے تمام ارکان پورے کروانا بہ ظاہر مشکل تھا مگر غزالہ ایسے چھوٹے موٹے جھوٹ اور گناہ کرنے کی عادی تھی۔

ایسا کرتے ہوئے اس نے کبھی خفت محسوس نہیں کی۔ بزرگ عورت اس کی ذمے داری تھیں۔ اس ذمے داری کو نبھانے میں اس کی اپنی غرض بھی شامل تھی۔ زندگی گزارنے کے لیے جو سہارا اس کو ملا تھا وہ بہ ظاہر بہت بودا تھا مگر اس کی افادیت کا اس کو خوب اندازہ تھا۔ وہ اس سے محروم ہونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ اس لیے "بچہ جمورا" کی طرح رات دن بوڑھی عورت کے اشاروں پر اٹھک بیٹھک کرتی رہتی تھی۔

اٹھ جاؤ، اٹھ گئی۔ بیٹھ جاؤ، بیٹھ گئی۔ فرش دھو لو، دھو لیا۔ چھوٹا سا جھوٹ بول کر وہ دل ہی دل میں مسکراتی: "میں آخر ہوں کون؟ بچہ جمورا، ذخیرہ جمع کرنے والی چیونٹی یا اونٹ؟"

اس کو اپنا آپ تلاش کرنے میں بڑا مزہ آتا۔

برسوں پہلے بچپن میں اس نے ایک کھیل کھیلا تھا۔

اس کی ساتھی لڑکیاں پوچھتی تھیں: "مچھلی مچھلی کِتنا پانی؟"

وہ پیروں پر ہاتھ رکھ کر بتاتی: اتا پانی!"

لڑکیاں پھر پوچھتیں: "مچھلی مچھلی کتنا پانی؟"

وہ سینے پر ہاتھ رکھ کر بتاتی: اتا پانی۔"

اور غڑاپ کہہ کر چھلانگ لگاتی اور گم ہو جاتی۔ سر تک پانی میں ڈوب کر بھی فوراً مل جاتی تھی اور اب ادھر قطرہ قطرہ پانی جمع کرتے ہوئے وہ ایسی گم ہوئی کہ اس کو اپنا آپ مل ہی نہ پاتا۔ وہ اپنی پہچان، شناخت اور اپنا آپ ہی اس چلو بھر پانی میں ڈبو بیٹھی۔ ان ہی خیالوں میں گم وہ بے خیالی میں اترتی ہوئی نیچے آ کر کھڑی ہو گئی۔

صبح کا دھلا دھلایا کھڑکھڑاتا لباس پہنے کرنل حمید اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے ہی والے تھے کہ وہ ان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی۔

"آپ غالباً کہیں جا رہے ہیں؟" اس کو معلوم تھا کہ وہ ریٹائرڈ ہیں۔ کبھی کبھار ہی گھر سے

نکلتے ہیں۔

"جی، آپ کو کچھ کام ہے؟"

"آپ ہی کمیٹی کے صدر ہیں؟"

"جی اس مرتبہ یہ چغد ہی پھنسا ہے۔"

"ہیں کرنل صاحب، یہ تو بہت بڑا اعزاز ہے۔"

"کیسا اعزاز! گناہ بے لذّت کہیے۔"

"نہیں جی، خدمتِ خلق عین عبادت ہے۔"

"اچھا آپ اپنا یہ وعظ کسی اور وقت کے لیے اٹھا رکھیں اور اپنا مطلب بتائیں۔"

"وہ، میں کہہ رہی تھی بائیں طرف والوں کے لیے پانی کا انتظام آپ نے ہی کیا ہے؟"

"جی اس وقت میں کمیٹی کا صدر نہیں تھا۔ اپنے جاب پر تھا، فل کرنل!" انھوں نے سینہ پھلاتے ہوئے کہا۔

غزالہ کا دل چاہا "زندہ باد" کہہ کر ان کو فوراً سلیوٹ کرے۔

"آپ کی طرف وافر پانی آتا ہے؟"

"جی وہ تو آپ دیکھتی ہی رہتی ہوں گی۔ ساری مشینیں رات دن چلتی ہیں۔"

"فاضل پانی گرتا بھی رہتا ہے؟"

"جی ہاں گرتا رہتا ہے،" انھوں نے لاپروائی سے کہا۔

"میں یہ کہہ رہی تھی کہ اگر ایک ایک ربر کا پائپ ہم سب میرا مطلب داہنی طرف والے آپ سب کی ٹنکیوں میں ڈال لیں تو ہمارا بھی پانی کا مسئلہ حل ہو جائے گا۔"

"آپ بھی کیا بات کرتی ہیں مسز احمد!" انھوں نے تمسخرانہ انداز میں غزالہ کو دیکھا اور بولے! "یہ پانی جو آپ ہمارے گھروں میں دیکھ رہی ہیں، یہ یوں ہی سیدھا سیدھا مین پائپ لائن سے نہیں چلا آرہا ہے۔ اس کو حاصل کرنے کے لیے ہم نے بہت کچھ کیا ہے۔ دراصل آپ کی طرف والے ہیں بھی گل محمد، کچھ کرتے ہی نہیں۔ عجیب لوگ ہیں۔ معجزوں کے انتظار میں بیٹھے ہیں۔" کرنل حمید کو بولنے کا ہوکا تھا اور جب سامع بھی غزالہ جیسا ہو، نوجوان، خوش شکل اور صرف

ہنکارا بھرنے والا۔ وہ بولے: "شہر میں پانی کا کال نہیں۔ ہر طرف پانی رواں ہے۔ پانی! پانی!" وہ بوڑھے ملاح بن گئے۔ غزالہ کا دل چاہا وہ مصرع کو آگے بڑھائے کہ "مگر پینے کے لیے تو ایک بوند بھی نہیں،" پر وہ خاموش کھڑی رہی۔ یہ وقت قابلیت جھاڑنے کا نہیں تھا۔ وہ کرنل حمید کی باتیں اور زیادہ انہماک سے سننے لگی۔ شاید وہ کوئی حل بتا ہی دیں۔ اس قدر قابل، اتنے لحیم شحیم، چھوٹے موٹے مسائل چٹکیوں میں حل کرنے والے! غزالہ ان کی بھاری بھرکم شخصیت سے پہلے خاصی مرعوب تھی۔

"آپ کی لائن میں بھی پانی آ سکتا ہے۔ آپ کو مسجد یا اسکول کسی سے بھی کنکشن مل سکتا ہے۔ اس کے لیے واٹر بورڈ والوں کو کچھ کھلانا پلانا پڑے گا۔ کچھ حضرات، میرا مطلب مردوں سے ہے، جا کر لائن مین سے ملیں۔ اس کے چائے پانی کا بندوبست کر کے اس کے مشوروں پر عمل کریں۔ وہ ٹھیک ہی بات بتائے گا۔ مگر ہاں، ان مشوروں کی بھی فیس ہوتی ہے۔ غریب مسکین آدمی ہے۔ اس کی بھی اپنی ضروریات ہیں۔ اور پھر اسی طرح معاشرے میں توازن پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر ہر بات کو گناہ کہہ کر مصیبت اٹھانے کا شوق ہے تو پھر کچھ نہیں ہو سکتا۔ پھر تو تیمم پر ہی گزارا کرنا پڑے گا۔

"ایک ایک سکشن پمپ آپ لوگ سب اپنے اپنے بلاک میں لگائیں۔ یہ بہت ضروری ہے۔ ہماری طرف کے بلاکوں میں جا کر دیکھیے سب ایک دوسرے کا پانی اسی پمپ سے کھینچ رہے ہیں۔ یہ سکشن پمپ بڑی کار آمد ایجاد ہے۔" وہ ذرا رکے اور پھر بولے:

"پانی حاصل کرنے کے لیے سب لوگ یہ کرتے ہیں کہ رات میں جب پانی کا زور زیادہ ہوتا ہے تو ٹارچ لے کر ہر بلاک کا چکر لگاتے ہیں اور جس بلاک کی ٹنکی سے پانی کی آواز سنتے ہیں اسی ٹنکی میں ٹارچ ڈال کر دیکھتے ہیں۔ جس ٹنکی میں پانی آتا ہوتا ہے اس کا مین سوئچ خاموشی سے بند کر دیتے ہیں اور اپنا کھول دیتے ہیں۔ ہر بلاک کا فرد دوسرے سے چھپ کر یہ ہی کام کرتا ہے۔ رات بھر یہی آنکھ مچولی ہوتی ہے۔ سوئچ آن، سوئچ آف۔ اور پھر صبح کو لبالب بھرے ہوئے پانی کے مزے لوٹتے ہیں، ببل باتھ، شاور باتھ، دھلا دھلایا چمکتا ہوا لباس اور خوشبوؤں کے بھبکے۔ ربر کا پائپ کچھ نہیں کر سکتا۔"

انھوں نے ڈگڈگی کے انداز میں ہاتھوں کو ہلایا، گاڑی اسٹارٹ کی اور روانہ ہو گئے۔ غزالہ حواس باختہ سی کھڑی ان کو جاتا ہوا دیکھتی رہی اور پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی اپنے فلیٹ کی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"واقعی بڑا گمبھیر مسئلہ ہے۔ ربر کا پائپ کچھ نہیں کر سکتا۔ رات کے اندھیرے میں ٹارچ ہاتھ میں لے کر ٹنکیوں میں جھانکنا۔ آتے ہوئے پانی کی مشین کا سوئچ بند کرنا اور اپنی مشین کا سوئچ کھولنا... اور صبح...

"غزالہ، ارشاد احمد کی بیوہ کل رات پانی کی چوری کرتے ہوئے پکڑی گئی۔"

یہ ہیں کرنل حمید اور ان کی روشن خیالی!

سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کو بہت زور کی ہنسی آئی۔ اندر کمرے میں بزرگ خاتون متواتر کھانس رہی تھیں۔ کھانستے ہوئے ان کو زور کا پھندا لگا اور نہائی دھوئی پاک صاف عورت پوری کی پوری ناپاک ہو گئیں۔ پیشاب کی ایک پتلی سی دھار ان کے بستر اور کپڑوں کو بھگوتی ہوئی رستے رستے کمرے کی دہلیز تک آ پہنچی تھی اور غزالہ پھر طہارت کی بالٹیوں اور کلمے کے لوٹوں کی فکر میں لگ گئی۔ نلوں سے حسبِ معمول قطرہ قطرہ پانی ٹپک رہا تھا۔ اس کے فلیٹ کے سامنے کپڑوں سے بھری ہوئی بالکونی تھی۔ وہی شب خوابی کے لباس، وہی سلک کے زیرجامے، وہی لیس کے محرم، وہی ملازم لڑکا اور اس کا چونکنا، وہی رنگین تولیے میں لپٹے ہوئے بالوں کے لچھے اور ان سے گرتے ہوئے پانی کے قطرے۔

"کچھ بھی تو نہیں بدلتا، نہ اِدھر نہ اُدھر۔ اندر کمرے میں اماں کھانس کھانس کر موت کی دہائی ڈال رہی ہیں۔ اب آخری غسل میں تو ڈنڈی نہیں ماری جا سکتی۔ خیر دیکھا جائے گا۔"

وہ قنوطی خیالات سے خود کو پریشان کرنے کے حق میں نہیں تھی۔ فرش پر پڑے ہوئے گندے کپڑوں کا ڈھیر اٹھا کر وہ غسل خانے میں آ گئی۔ کپڑوں کو غسل خانے کے فرش پر ڈالا۔ پیروں سے بالٹیوں کو نلوں کے نیچے رکھ دیا اور اپنی بالکونی میں کھڑے ہو کر گدھے والے کا انتظار کرنے لگی۔

گاڑی پر ایک زنگ خوردہ جست کی ٹنکی لگائے اپنے مردے سے گدھے کو سڑک پر آہستہ

آہستہ ہنکاتا ہوا پانی والا غزالہ کی اکلوتی امید تھا۔ باہر فلیٹوں کی ٹنکیوں سے فاضل پانی مستقل گر رہا تھا۔ کرنل حمید اور ان جیسے بہت سے روشن خیال لوگوں کی روشن خیالی چھتوں سے گر گر کر زمین کی مٹی میں رل مل رہی تھی۔ لوگ ہواخوری کے لیے ساحلِ سمندر کی طرف رواں تھے، اپنے کتوں کی زنجیریں پکڑے اور دھات چڑھی ہوئی چھڑیوں کو گھماتے ہوے۔

"ہم آج وہی ہیں جو کل تھے۔ نہ روشن خیال اور نہ بنیاد پرست۔ ہم سب بھیڑیے ہیں اور بس۔ بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر پائیں۔"

اندھیرا بڑھ جانے پر شام کے چوکیدار نے عمارت کی سب روشنیاں اور پانی کی سب مشینیں کھول دیں۔ فضا میں مشینوں کے چلنے، پانی کے گرنے اور بھرنے کا کا شور ابھرا۔ غزالہ کے غسل خانے میں بھی بوند بوند گرتے ہوے پانی کی آواز میں کچھ تبدیلی سی پیدا ہوئی۔ کمرے کی دھندلی روشنی میں غزالہ کی آنکھیں چمکیں۔ بزرگ عورت کو کھانسی کا پھندا لگا اور ان کا سانس اکھڑنے سا لگا۔ ان کی اکھڑتی سانسوں سے گھبرا کر وہ پھر غسل خانے میں گئی۔ پانی ایک پتلی سی دھار کی صورت میں بالٹیوں میں گر رہا تھا۔

"لائن مین نے شاید بھولے سے آج ہمارے بلاک کی ایک دو چوڑیاں زیادہ گھما دی ہیں۔ یا شاید اماں کی وہ نیکی ہے جو حکیم بینا کے کہنے پر انھوں نے خاموشی سے زمین میں بو دی تھی۔" غسل خانے کی تینوں بالٹیاں بھرنے کے بعد خوشی اور اطمینان کا ملاجلا احساس لیے وہ واپس کمرے میں آ کر بوڑھی عورت کے سرہانے بیٹھ گئی اور ان کے بتدریج اکھڑے ہوے سانس کو خاموشی سے سننے لگی۔

جاگنگ پارک

"چالیس منٹ برِسک واک اور کنٹرولڈ ڈائٹ،" ڈاکٹر آندھرے جو اپنی آرام کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے اور زبیدہ کی الٹراساؤنڈ اور بلڈ رپورٹ کو بڑی دیر سے دیکھ رہے تھے، بولے۔

زبیدہ ان کے سامنے ٹین کے ایک تکلیف دہ اسٹول پر بڑی بے آرام سی بیٹھی ہوئی تھی اور سوچ رہی تھی کہ آخر یہ ڈاکٹر حضرات مریضوں کے بیٹھنے کے لیے اس قدر تکلیف دہ اسٹول کیوں استعمال کرتے ہیں۔ یہ بھی شاید ان کی پالیسی میں شامل ہے، تاکہ مریض جب اس اسٹول سے اُٹھے تو اپنے امراض میں مزید ایک مرض کا اضافہ کر کے اُٹھے: خونی بواسیر۔

برِسک واک اور ڈائٹ کا مشورہ دینے کے بعد انھوں نے رپورٹس زبیدہ کی طرف بڑھائیں اور پھر بولے:

"سب ٹھیک ہے۔ معمولی سے لپڈس بڑھے ہوئے ہیں۔ یورِک ایسڈ بھی ٹھیک ہے۔ پیشاب کی رپورٹ بھی درست ہے۔ ہیموگلوبن بھی تیرہ ہے، یعنی بہت بہتر۔ کلسٹرول بڑھنے کا اندیشہ ہے۔ فی الحال تو وہ بھی ٹھیک ہے۔ البتہ آپ کا وزن زیادہ ہے۔ اس کو برِسک واک اور ڈائٹ سے ہی کنٹرول کیجیے۔ یہی آپ کا علاج اور یہی دوا۔"

"اور وہ دَم گھٹنا!" زبیدہ ہکلائی اور پھر بولی:

"ڈاکٹر صاحب، میرا گلا بالکل بند ہو جاتا ہے۔ زبان کٹنے لگتی ہے۔ ناک میں سرسراہٹ، گلے میں خرخر۔ اِنسومنیا۔ تھوڑا کھا کر بھی بھاری پن کا احساس۔ پھر یہ سب کیا ہے؟"

"وہم! جس کا علاج حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں،" ڈاکٹر صاحب نے بے پروائی سے کہا۔
"میں تو اپنے گھر میں سارا دن چلتی ہوں۔ گھر کا سب کام خود ہی کرتی ہوں،" وہ پھر بولی۔
"کام آپ بے شک نہ کریں۔ گھر میں سارا دن بیٹھی بھی رہیں۔ لیکن دن کے کسی بھی وقت باہر نکل کر چالیس منٹ کی برِسک واک آپ کا واحد علاج ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے گھنٹی بجا کر دوسرے مریض کو طلب کیا۔

زبیدہ غصّے سے پیر پٹختی ہوئی ڈاکٹر کے کمرے سے نکلی۔ وہ خود ہی خود بول رہی تھی: "ایک ہزار روپے رپورٹس پر خرچ ہوئے، چار سو روپے فیس کے لے لیے، اور علاج کیا بتایا، برسک واک!"

اس شہر میں رہنے والی گھریلو عورتوں کو باہر نکل کر برسک واک کا مشورہ دے رہے ہیں! بالکل ہی سٹھیا گئے ہیں۔ سڑک پر دہشت گردی اور ڈاکوؤں کے گروہ۔ گلیوں اور محلّوں میں کلاشنکوف تھامے ہوئے رینجرز۔ کانوں کے پردے اُڑا دینے والی گولیوں کی آوازیں۔ انسانی لاشوں کے خون سے لت پت سڑکیں۔ اور پھر اس ریگستان میں کون سے پارک اور باغ ہیں جہاں جا کر کوئی شریف عورت برسک واک کرے؟ یہ بھی کوئی اپنا خیر آباد ہے جہاں میلوں پھیلا ہوا لالہ ٹکی لَل کا ہرا بھرا باغ تھا جہاں جوہی اور مولسری ایک ساتھ کھِلتے تھے، جہاں فضاؤں میں گھاس اور تازہ پھولوں کی مہک تھی، جہاں چڑیوں اور پرندوں کی چہکاریں تھیں...

یہ پیاری پیاری چڑیاں پھرتی ہیں جو چہکتی
قدرت نے تیری ان کو تسبیح خواں بنایا

اور جہاں لالہ کی پرنانی یا سگڑنانی، جن کو چڑیوں اور پرندوں کے ساتھ رہتے رہتے ایک عرصہ ہو گیا تھا اور جو ان چڑیوں اور پرندوں کی زبان بھی سمجھنے لگی تھیں، مولسری کے درخت کے نیچے گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رہتی تھیں---

سلیماں سر بہ زانو اور سبا ویراں

وہاں چالیس منٹ تو کیا، انسان سارا دن چل سکتا تھا۔ "کہتے ہیں آپ کو وہم ہے، اور وہم کا علاج

حکیم لقمان کے پاس بھی نہیں۔ ہُنہ!"

حکیم کے لفظ پر زبیدہ کو رتن تلاؤ والے حکیم قدوس کا خیال آیا جو اونچا سنتے تھے اور ان کی بینائی بھی جاتی رہی تھی، پر زبیدہ کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہی انھوں نے جو بات کہی تھی اس نے زبیدہ کے سارے نسوانی، ذہنی اور جسمانی امراض پر جیسے پھاہا سا رکھ دیا تھا۔

"بیٹی، پیٹ اُم الامراض ہے۔ بس اس کا خیال رکھو تو جسم کا سارا کارخانہ ٹھیک چلتا رہے گا۔"

ان کے مطب میں اکثر و بیشتر مریضوں کو نسخہ بھی خود ہی لکھنا پڑتا تھا اور مطب کے پچھلے حصے میں جا کر دوا کی پڑیاں بھی خود ہی بنانی ہوتی تھیں۔

جوارشِ جالینوس، بڑ بھیڑہ، گاؤزبان اور شربتِ بیضوری۔ خمیرہ ابریشم جواہر والا کی ڈبیا نسخے میں شامل نہ ہونے کی صورت میں بھی زبیدہ اپنی دوا میں ضرور شامل کرتی تھی، کھانے کے بعد دونوں وقت کے میٹھے کے لیے۔ حکیم صاحب بچارے ایکاایکی مر گئے۔ ورنہ زبیدہ کو کیا پڑی تھی کہ وہ ان سرپھرے ڈاکٹر صاحب کے پاس آتی جو اس کے سارے امراض کو پسِ پشت ڈال کر برسک واک کا مشورہ دے رہے ہیں۔ برسک واک نہ ہوئی آبِ حیات ہو گئی کہ برسوں کے پیچیدہ امراض جن کو ایک عرصے سے مرغن کھانے پکا پکا کر اور کھا کھا کر گھر کی چہار دیواری میں بیٹھ کر اس نے پالا تھا، ختم ہو جائیں گے۔ اور چلو واک بھی کر لو، مگر کہاں؟

"پڑوسیوں کے سامنے دھما دھم کودوں؟"

مشکل تو یہ تھی کہ وہ ایک بنیاد پرست معاشرے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے نزدیک مذہب اور بنیاد پرستی ایک ہی چیز کے دو نام تھے۔

وہ اپنے سنیاسی باوا بھی تو ہیں۔ گھٹا ٹوپ اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن! فیڈرل بی ایریا، ناظم آباد اور نارتھ ناظم آباد کی دیواروں پر لکھا ہوا سنیاسی باوا کا نام اور ان کی کرامات ایک ایک کر کے اس کی نظروں کے سامنے گھومنے لگیں۔

"آپ مایوس نہ ہوں۔ مردانہ کمزوریوں کا شرطیہ علاج۔ شربتِ اکسیر۔ عورتوں کے لیے پردے کا خاص انتظام۔ ہمارا شربت جوبن بہار آپ کی لُٹی ہوئی بہاریں واپس لا سکتا ہے۔"

اِن ہنگاموں کے دنوں میں فیڈرل بی ایریا جانا اور سنیاسی باوا کو ڈھونڈنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ وہ ہونقوں کی طرح منھ کھولے شہر کو ٹٹولنے لگی۔ شاید کوئی باغ نظر آجائے، کوئی پارک، کوئی چھوٹا موٹا میدان ہی سہی، جہاں وہ سب کی نظروں سے چھپ کر تیز تیز چل سکے۔

بوڑھا صحافی اردیشر کہہ رہا ہے:

"یہ پورا شہر ایک پارک کے مافق تھا، صاف ستھرا۔ اِن سالا لوگ نے پورے شہر کا بیڑا غرق کر دیا۔ ام بولا بابا ڈرم میں جا کر تھوکو۔ یُوزمی والے ڈبّے کو استعمال تو کرو۔ پر وہ تو ایدھر روڈ پر تھوک مارتا ہے۔ باپ رے باپ، اتنا بڑا بڑا خون کے مافق تھوک۔ وہ اپنا نسروانجی جب میئر لگا تھا، روڈ شیشے کے مافق چمکتا تھا۔ ہر طرف پارک ہی پارک تھا۔ اب پتا ہی نہیں چلتا روڈ کدھر ہے، پارک کدھر ہے۔ سالا لوگ پورا شہر بیچ کر کھا گئے۔ ام بولتا ہے بچوں کے لیے پارک بناؤ، وہ بولتا ہے ام پلازا بنائے گا۔ لونڈیا کا کاروبار کرتا ہے پلازا بنا بنا کر۔"

کلفٹن برِج سے اتر کر تین تلواروں والے چوراہے سے گزر کر آغا سپر مارکیٹ والے چوراہے پر جب وہ سیدھے ہاتھ کی طرف خیابانِ رومی پر مڑی تو بوٹنگ بیسِن اور بلاول ہاؤس کی طرف جاتے ہوئے بائیں ہاتھ کی طرف اس کو بالآخر ایک پارک نظر آ ہی گیا: جاگنگ پارک۔

اس نے گاڑی کو اسی سڑک پر موڑا۔ دور سے بھٹے والے کے ٹھیلے پر جلتی آگ کی لپٹیں لال لال زبانیں نکال کر اس کو اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ بھُنے ہوئے بھٹّوں کی خوشبو دور دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ٹھیلے کے گرد بچے اور بڑے گھیرا ڈالے کھڑے تھے، اپنی باری کے انتظار میں۔ پارک کے باہر حدِ نظر تک چھوٹی بڑی گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوئی تھیں جن میں پجارو اور لینڈ کروزر بھی شامل تھیں، سیاسی لیڈران کی، جن کے دونوں طرف کلاشنکوف لیے ہوئے باڈی گارڈ یا کمانڈوز، اور جن کے متعلق اب مشہور ہے کہ انھوں نے اپنے بیت الخلاؤں میں بھی دو کموڈ رکھوائے ہیں، ایک اپنے لیے اور ایک اپنے کمانڈو کے لیے۔ دو کمانڈو باہر پجارو اور لینڈ کروزر پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ مکمل حفاظت، ایک مرگِ ناگہانی سے بالکل محفوظ!

شاید یہ لطیفہ ہو، مگر جاگنگ پارک کے باہر جو حفاظتی انتظامات نظر آئے ان کو دیکھ کر شبے کی گنجائش نہیں رہی۔ زبیدہ نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر کے جاگنگ پارک کا ایک سرسری سا

جائزہ لیا۔

مئی کا اوائل۔ فضا میں تازہ گھاس اور پھولوں کی مہک تھی۔ زمین کے اندر سے نئی کونپلیں سر اٹھا رہی تھیں۔ درختوں کے پتے جھڑنے کے بعد ہلکے ہرے پتے نکلنے شروع ہو گئے تھے جو بتدریج سبز کاہی رنگ میں تبدیل ہوتے جا رہے تھے۔ ہر طرف ہلکا ہرا، گھرا ہرا اور سبز کاہی رنگ پھیلا ہوا تھا۔ وسیع اور کشادہ لان ہری بھری گھاس سے بھرے ہوئے تھے۔ ڈھاکا ٹیرس۔ میدان میں لگے ہوئے بجلی کے کھمبوں پر برقی روشنی کے تیز بلب روشن تھے۔ ہیڈمالی کے گھر سے جو پارک کے ایک کونے میں ٹین کی چھت ڈال کر بنایا گیا تھا، شاید کوری مٹی کی ہنڈیا میں دودھ اُبل رہا تھا اور اس کی مہک بیرونی ممالک سے لائے ہوئے کلون، پرفیومز اور سینٹ کی ہوش رُبا خوشبوؤں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی فضا کو مسحور کر رہی تھی۔

چہل قدمی کرنے والے کچے اور پکے راستے (ٹریک) عورتوں مردوں اور بچوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ایک خلقت تھی جو دوڑ میں مصروف تھی۔ ہر طبقے، ہر عمر اور ہر قد کاٹھی کی مخلوق۔ مریض، صحت مند، جوان، بوڑھے، بچے، مرد، عورت، خوبرو، بدشکل، مفلوج معذور ویل چیئرز پر، سائیکل سوار، تاجر، صنعت کار، وزیر، مشیر، سیاست داں، صحافی اور دانشور۔ جنریشن گیپ کا لیبل لگائے نوجوان نسل —— بے نتھے بچار —— اور ان کو کن انکھیوں سے دیکھنے والی بزرگ نسل، جوان کو دیکھ بھی رہے تھے اور محظوظ بھی ہو رہے تھے۔ محظوظ ہونا ان کی مجبوری تھی۔

زبیدہ نے جاگنگ پارک کا ایک چکر لگایا اور باہر نکل آئی۔ اب اس نے اپنی گاڑی کو ڈیلاوالی سڑک پر موڑا جہاں چورا ہے کے بائیں طرف باسکن آئس کریم، باٹا اور سروس شوز کی دکانیں برابر برابر تھیں اور اس وقت بچوں اور بڑوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ اسکول کی چھٹیاں ختم ہو چکی تھیں اور بچے "پہلے باٹا پھر اسکول" والے جنگل پر عمل پیرا تھے اور بیک وقت آئس کریم، جوتے اور جرابیں خرید رہے تھے۔ زبیدہ اس بھیڑ کو چیرتی ہوئی باٹا کی دکان میں گھس گئی اور مختلف جوتوں کو اپنے پیروں میں ڈال ڈال کر دیکھنے لگی۔ کوئی چھنگلی دبا رہا تھا تو کوئی تلوا۔ کسی کا سول پتلا تھا تو کسی کی ٹو گھوڑے کی شکل سے ملتی تھی۔ کوئی پنجے پر سے تنگ تھا تو کوئی ایڑی میں کھب رہا تھا۔ "جوتا خریدنا بھی اچھی خاصی مشقت ہے،" اور جوتا بھی وہ جس سے مستقل چالیس منٹ تیز تیز

چلنا تھا، اس لیے زبیدہ کچھ زیادہ ہی محتاط ہو کر جوتے پہن اور اتار رہی تھی۔ باٹا سے نکل کر وہ سروس میں جا گھسی۔ وہاں بھی وہی حال، وہی جوتے، جرابیں، وہی آئس کریم کے گلاس اور وہی بچوں کی بھیڑ۔ اس نے دو چار چھوٹے بڑے سروں کو پھلانگتے ہوئے شیلف پر سے ایک نیلے رنگ کا کینوس کا جوتا اٹھایا جس کا ایک پیر ایک بچے کے آئس کریم کے پیالے میں جا گرا۔ بچہ "ایڈیٹ" کہہ کر غرّایا۔ آج کا بچہ، کل کا سیاست داں۔ زبیدہ نے جوتا پیر میں ڈالا۔ آئس کریم سے لت پت جوتا اس کے پیر میں پورا فِٹ بیٹھا تھا۔ کاؤنٹر پر پیسوں کی ادائیگی کے بعد اس نے اپنے پرس کے اندر جھانکا۔ الٹرا ساؤنڈ، بلڈ رپورٹ، ڈاکٹر کی فیس اور واکنگ شوز۔۔ پورے سترہ سو روپے خرچ کرنے کے بعد اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور گاڑی میں بیٹھے ہی بیٹھے ڈائٹنگ اور برسک واک کا ارادہ کر ڈالا، جو بقول ڈاکٹر آندھرے اس کا علاج تھا اور اب تو مجبوری بھی تھی۔ گھر کے بجٹ میں سے سترہ سو روپے کا خسارہ کسی نہ کسی طور تو پورا کرنا تھا۔

دوسرے دن غروبِ آفتاب کے بعد جوتے موزے پہن کر اس نے جاگنگ پارک کا رُخ کیا۔

پارسی صحافی اردیشر اور اس کی سیکرٹری امینہ اپنے مدّاحوں کے جلو میں تیز تیز چل رہے تھے۔ اردیشر، کراچی کا بوڑھا صنعت کار صحافی، جو ماہرِ ماحولیات بنا ہوا تھا اور شہر کو خوب صورت بنانے کی کوشش میں حکومت اور بلند عمارات بنانے والے ٹھیکے داروں سے برسرِ پیکار تھا، کہہ رہا تھا:

"کراچی میں تو پہلے ہی جنگلات نہیں تھے۔ اب ان لالچی لوگوں نے شمالی علاقوں کے بھی جنگل ختم کر دیے۔ یہ لوگ جنگلوں کو فصل کی طرح استعمال نہیں کرتے بلکہ معدنی کانوں کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ سالا لوگوں نے کراچی کو کھنڈر بنا دیا ہے۔ زمینیں بیچ کر کھا گئے۔ بچوں کے کھیلنے کے میدانوں اور پارکوں پر اونچی اونچی اور گندی بلڈنگیں بنا دیں۔ اب اس پارک پر بھی دانت لگائے بیٹھے ہیں گِدھ کی اولاد۔ ایسی تیسی کر ڈالی پورے شہر کی۔ سن پینتالیس کا یہ شہر بیرونی ملکوں کے سیاحوں کا ایک خوب صورت خواب تھا۔ آج ان گِدھوں کی خوراک بن چکا ہے۔"

زبیدہ کے آگے ایک تیز طرّار لڑکی ٹائٹ جینز اور کولھوں سے اوپر والا بلاؤز پہنے اپنے بھاری

بھرکم کولھوں کو دائیں بائیں ہلاتی ہوئی تیز تیز چل رہی تھی۔ اس کی چال میں ایسی کشش تھی کہ لمحہ بھر کو زبیدہ اس کی شکل دیکھنے کے لیے بے چین ہو گئی۔ اسے پہچاننے میں اس کو ذرا دیر نہیں لگی۔ وہ ماموں مبارک علی کی پندرہ سالہ پوتی حرا تھی۔ ماموں مبارک علی نے زندگی بھر عورتوں کی بے باکی اور بے پردگی پر دھواں دھار تقریریں کی تھیں، اور گزشتہ ربع صدی میں خاندان بھر کی نوجوان لڑکیوں کے لیے ہوّا بنے رہے تھے۔ لڑکیوں کے نقاب سے عاری کھلے منہ دیکھ کر ان پر تھوک دیا کرتے تھے۔ ان ماموں مبارک علی کی پوتی نیلی جینز اور سُرخ بلاؤز میں اپنے نسوانی اُبھاروں کا مظاہرہ کرتی ہوئی مرد تو مرد، عورتوں کو بھی دعوت نظارہ دے رہی تھی۔

دور میدان میں کرکٹ کی دنیا کے مشہور کھلاڑی کی نئی سانولی، ٹیلنٹڈ اور دولت مند بیوی لکڑی کی ایک کِرم خوردہ بنچ پر اُو بھی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ اس کو اس ہرے بھرے لان میں بچھی اس کِرم خوردہ بنچ کی تُک سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ وہ غالباً اُن آرائشی کرسیوں کے بارے میں سوچ رہی تھی جن کو وہ خود ڈزائن کرتی تھی اور بیرونی ممالک میں بھیجتی تھی۔ اس کا بھاری بھرکم شوہر، جو کبھی اپنے چوکوں چھکوں، مردانہ وجاہت اور کسرتی بدن کے لیے ہزاروں دلوں کی دھڑکن تھا، جاگنگ پارک کے کچے راستے پر کسی بھاری بھرکم ہاتھی کی طرح ہانپ ہانپ کر دوڑ رہا تھا۔

زبیدہ نے لان میں بیٹھی ہوئی اس کی نئی نویلی بیوی کو ایک بار پھر دیکھا، اور تب اس کو ایک اَور عورت کا خیال آیا جو عورت بھی تھی، بیوی بھی تھی اور دو معصوم بچیوں کی ماں بھی تھی۔ وہ بھی شاید کسی کِرم خوردہ بنچ پر بیٹھی اب حالات سے سمجھوتا کر چکی ہو گی۔ اس نے اپنی رفتار تیز کر دی۔

لان کے ایک گوشے میں پورا دستر خوان بچھا تھا۔ کوئی میمن خاندان بھیل پوری اور چھولے کی چاٹ، گول گپّوں کا ٹوکرا اور پان مسالے کے ڈبّے سجائے پکنک منانے میں مشغول تھا۔ بچے، جو کھیل میں زیادہ کھا گئے تھے، سبز لان پر پھٹے ہوئے دودھ جیسی اُلٹیاں کرنے میں مصروف تھے۔ بھیل پوری، دہی پکوڑے اور پان مسالے کا ملاجلا ملغوبہ پورے لان میں بکھرا ہوا تھا۔ مالی اس پورے خوش باش خاندان کو گھور رہا تھا جو اس کی نظروں سے بے خبر ملکی مسائل پر تبادلۂ خیال کر رہے تھے۔

خوشبو کا تیز بھپکا زبیدہ کی ناک میں گھستا چلا گیا۔ دونوں عورتیں لمبے لمبے چغے پہنے ہوئے تھیں۔ گلے میں پڑی ہوئی سونے کی زنجیریں چلتے میں گرجا کی گھنٹیوں کی طرح بجتی تھیں۔ یسوع مسیح کی یہ بھیڑیں سیاہ لباس میں سر سے پیر تک ڈھکی ہوئی تھیں۔ جسمانی اعضا کی نمائش کی اس دوڑ میں بی بی مریم اور ماریا قبطیہ کہیں سے بھٹک کر آ گئی تھیں۔

دور ساسی والوں کے بنائے ہوئے جدید وضع کے مکان میں آرام کرسی پر دراز ماموں مبارک علی اپنی پندرہ سالہ پوتی حِرا کا انتظار کر رہے تھے جو جاگنگ پارک میں تیز تیز چلتے ہوئے بار بار رُک جاتی تھی، اپنے روغنیات اور چربی چڑھے جسم کا جائزہ لینے کے لیے۔ ایک چکّر میں جسم کے کتنے حرارے پگھلتے ہیں، اس کا اندازہ اُسے تھا۔ وہ ایک مدّت سے جسم کے ان حراروں کو پگھلانے کے لیے جاگنگ پارک میں تیز تیز چل رہی تھی۔ ادھر ماموں مبارک علی اس سے اور اس جیسی ساری بھاری کولھوں اور کھلے چہروں والی لڑکیوں سے خوش تھے جو اپنے نسوانی اعضا کو متناسب رکھنے کے لیے صبح شام جاگنگ پارک جا کر برِسک واک کرتی تھیں۔

ہفتہ بھر کی برِسک واک سے ہی زبیدہ کو بہت فائدہ ہوا تھا۔ نہ صرف یہ کہ جسم پر چڑھی ہوئی چربی کم ہونا شروع ہو گئی تھی، بلکہ ذہن پر بھی جو ٹھوس برف کی تہہ جمی ہوئی تھی وہ بھی آہستہ آہستہ پگھلتی جا رہی تھی۔ وہ جو اَب تک کنویں کا مینڈک بنی اپنے ہی اندر ڈبکیاں کھاتی رہی تھی، ایک ہی چھلانگ میں باہر نکلی تو دنیا ہی اَور تھی۔ بقول شخصے، ایسا معلوم ہوتا تھا "جیسے پاکستانی خواتین آج کل بہت دباؤ میں تھیں، اس لیے کہ ان کے وہ اعضا جن کو وہ نمائش کے لیے استعمال کرتی تھیں، یعنی چھاتیاں، کولھے اور پنڈلیاں، وہ روغنیات یا کسی اَور وجہ سے فربہی کی طرف مائل تھے اور ان کو قابو میں رکھنے کے لیے خواتین کو پریشان کن حد تک ڈائٹنگ اور واک کرنی پڑ رہی تھی۔"

جاگنگ پارک کے پکّے راستے پر جھکی ہوئی جوانیوں سے نکلتی ہوئی خواتین جلد از جلد وزن کم کرنے کی کوشش میں بے تکان دوڑ رہی تھیں۔ ان کی یہ کوشش مردوں کو اپنی طرف مائل کرنے کی سعیِ لاحاصل تھی۔ پھیلے ہوئے دائیں بائیں ہلتے ہوئے کولھے، ڈھلکی ہوئی بھاری چھاتیوں پر جرزی کے منڈھے ہوئے بلاؤز، پنڈلیوں پر ڈھلتی ہوئی عمر کے نشان ان کی تنگ مُہریوں والی جینز میں سے صاف نظر آ رہے تھے۔ وہ سب اپنا وزن جلد سے جلد کم کرنے کی لاحاصل کوشش میں لگی ہوئی

تھیں۔ مرد، جو بیک وقت دانشور، سیاست داں، صحافی اور کھلاڑی سب ہی تھے، اوّل و آخر مرد تھے۔ ان میں بیشتر کو خود نمائی اور نمائش کا جو موقع ملا تھا اُس کو وہ گنوانا نہیں چاہتے تھے۔ وہ خود نمائی کو مبالغہ آمیز حد تک لے گئے تھے۔ اپنی بھاری بھر کم رانوں کی نمائش کے لیے کسی ہوئی نیکریں پہن رکھی تھیں۔ بازو کی مچھلیوں کو گولائی میں مروڑتے ہوئے وہ نوجوان لڑکیوں کے سامنے سے ایسے گزرتے تھے جیسے جہاں سے گزر رہے ہوں۔ کھلے گریبان اور بنیانوں میں سے نظر آتے سیاہ بالوں کے گچھوں کی نمائش، تنگ نیکروں کے اندر سے دکھائی دیتا ہوا پیڑووں کا اُبھار، اور پھر نوجوان عورتوں کو آتا ہوا دیکھ کر جنسی کج روی سے مغلوب ہو کر اپنے اعضا کی نمائشی مالش میں مصروف ہو جانا، یہ سب اُن کی برسک واک میں شامل تھا۔

ان ہی میں سے کوئی مسٹر کراچی بن کر کھڑا ہو جاتا اور اپنے آگے اور پیچھے کے دھڑ کو عجیب و غریب انداز میں ہلاتا ہوا گزر جاتا۔ زبیدہ حیران آنکھوں سے، اور تیز تیز چلتے ہوئے یہ سب کچھ دیکھتی۔ دیکھنا اس کی مجبوری تھی۔ اس کو چالیس منٹ کی برسک واک جو کرنا تھی۔

بہت سی نوجوان لڑکیاں ایک ساتھ اور ایک ہی سمت میں چل رہی تھیں۔ دروازے میں سے ایک آدمی، عمران خان سے ملتا جلتا، پارک میں داخل ہوا۔ چلتی ہوئی لڑکیوں کے قدم ایک ساتھ رک گئے۔ لڑکیوں کو اپنی طرف آتا دیکھ کر بازو کو مچھلیوں کو دکھانے والے نوجوان نے پیڑو کو سہلانا شروع کر دیا، اپنے پیٹ کو دبایا اور گھٹنوں کے بل بیٹھ کر مینڈک کی طرح اُچھلنے لگا۔ لڑکیوں نے اس کی حرکتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی واک جاری رکھی۔ وہ جس قدر تیزی سے چل رہی تھیں اُسی قدر تیزی سے بول رہی تھیں۔

''کل شام کی پارٹی میں دہی پھلکیاں۔۔۔ واٹ اے ونڈرفل آئٹم! بٹ پیسٹریز ور ناٹ گڈ۔''

''بیکرز بچ سے منگائی تھیں۔ لیلیٰ کنجوس کی بچی کلف کول سے اٹھا لائی۔''

''کلف کول کا بس پیزا اچھا ہوتا ہے،'' حرا نے کہا اور اپنے بھاری کولھوں پر ہاتھ رکھ کر اُن حراروں کا اندازہ لگایا جو وائٹل سائنز کو دیکھ اور سُن کر اور پیزا کھا کر ایک دم بڑھ گئے تھے۔ اس نے چلتے ہوئے اپنے بھاری جسم کو زور زور سے جھٹکے دیے۔ ایسا کرتے ہوئے اس کے بلاؤز کے سامنے

کے بٹن کھل گئے۔ اس کی گداز چھاتیوں پر لیس کا محرم جس کے درمیان میں ایک خوب صورت بو بھی لگی ہوئی تھی، لڑکیوں کو حیران کر گیا۔

"کہاں سے خریدا ہے؟" ایک ساتھ بہت سی آوازیں بلند ہوئیں، اور حِرا چلتے چلتے اپنے بٹن بند کرنے لگی۔

سامنے والے دروازے کے سامنے سرسبز لان پر ایک جماعت ابھی ابھی آ کر بیٹھی تھی جس میں کچھ ناکام سیاست داں تھے جو کرتے پجامے میں ملبوس تھے۔ چند اونچی شلواریں پہنے اور کندھوں پر رومال ڈالے تبلیغی جماعت کے لوگ، جن میں نوجوان بھی تھے اور ادھیڑ عمر کے امیرِ جماعت بھی۔ سندھی، میمن، پنجابی، پٹھان -- یہ ایک ملی جلی جماعت تھی جن کے اپنے اپنے موضوع تھے۔ ایک سیاست داں جو حلیے اور چہرے مہرے سے ناکام لگتے تھے، لیاقت علی خاں کا موازنہ موجودہ سیاست دانوں سے کر رہے تھے۔

"سیاست داں بس ایک ہی تھے، وہ اپنے لیاقت علی خاں۔ بھری اسمبلی میں نہرو کو دھوتی پرشاد کہہ دیا۔ ہے نا ہمّت کی بات؟" ایک زور کا قہقہہ پڑا اور دوسرے صاحب بولے:

"وہ عمران خان جو پریشر گروپ بنا رہا ہے وہ کیا چیز ہے؟"

"چیز کا تو ہمیں بھی پتا نہیں۔ ایدھی نے بھانڈا تو پھوڑ دیا۔ زور ذرا کم ہو گیا ہے اس پریشر لکر کا۔"

"آپ ستار بھائی کو کچھ نہیں بولینگا۔ وہ بچارا تو آپ لوگوں کی لاشیں اٹھا اٹھا کر دفنا رہا۔ نہ کرے تو بنیں گی نا گدھوں کی خوراک!"

"گِدھ اب مُردار نہیں کھاتے،" دور پیڑ کے نیچے کھڑا بوڑھا صحافی اردیشر بولا۔

"وہ تو اچھا اچھا ہَپ کرنے میں لگے ہیں،" لیاقت علی کے حمایتی بولے۔

"تضیعِ اوقات سے فائدہ؟ آپ لوگ خواہ مخواہ دوسروں میں کیڑے نکال رہے ہیں۔ حضرات، اپنا محاسبہ کیجیے پہلے،" ایک صاحب بولے جو شاید تبلیغی جماعت کے امیر تھے۔ انھوں نے لان میں چلتی ہوئی لڑکیوں کے جسمانی نشیب و فراز سے بہ مشکل تمام اپنی نظروں کو بچاتے ہوئے خطیبانہ انداز میں کہا:

"جب کسی قوم یا بستی پر عذاب آجائے تو صرف وہ لوگ بچا لیے جاتے ہیں جو آخری وقت تک برائی سے روکنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔"

"اس شہر میں تو کوئی ایسا فرد نظر نہیں آتا،" دوسرے صاحب بولے۔

"اس قدر مایوس ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسلام میں مایوسی یوں بھی کفر ہے،" امیرِ جماعت بولے۔

"کئی بار ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان کے لیے آخری حد مقرر کر دی جاتی ہے۔ اگر وہ اسے بھی پار کر جائیں تو ان پر فوراً عذاب وارد ہو جاتا ہے۔"

"اب کون سی حد باقی رہ گئی؟ ہم ساری حدیں تو پھلانگ چکے ہیں۔" ایک نوجوان، جو تبلیغی جماعت ہی سے تعلق رکھتا تھا مگر اس نے شلوار کی جگہ جینز پہن رکھی تھی اور داڑھی بھی فرانسیسی طرز کی تھی، جوش اور جذبے میں سب سے آگے تھا۔

"صبر، صاحب زادے، صبر۔ صبر کی بھی اسلام میں بڑی فضیلت ہے۔ سورہ النسا میں اللہ نے فرمایا ہے: اللہ تمھیں عذاب دے کر کیا کرے گا، اگر تم صبر کرو اور اس کا شکر کرو، اس پر ایمان لاؤ، اور اللہ قدر شناس ہے۔ تمھیں خوف زدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ اسلام دینِ فطرت ہے۔ اس میں اچھے اور برے سب کے لیے حدود مقرر ہیں۔ سورہ ھود میں صاف صاف وضاحت کی گئی ہے: جب کسی قوم پر عذاب آیا، پیغمبر اور اس کے ساتھ ایمان لانے والے لوگوں کو عذاب سے بچا لیا گیا۔ حضرت نوحؑ اور ان کے ساتھی غرق ہونے سے بچ گئے، مگر چوں کہ ان کا بیٹا کافر تھا، وہ غرق ہو گیا۔ حضرت لوط اور ان کا کنبہ بچا لیا گیا، مگر ان کی بیوی نہ بچ سکی کیوں کہ وہ بستی کے لوگوں کو جو بُرا کام کرتے تھے، دل سے بُرا نہیں سمجھتی تھی۔"

یہ سن کر وہ نوجوان کچھ اَور زیادہ بے چین ہو گیا۔ وہ اپنے راشی باپ کی لینڈ کروزر میں بیٹھ کر آیا تھا جو باہر کھڑی تھی۔ اس میں دو گارڈ کلاشنکوف سنبھالے بیٹھے تھے اس کی حفاظت کے لیے، کیوں کہ اس کو جماعت کے ساتھ رائےوِنڈ جانا تھا۔

"میرا حشر بھی حضرت لوط کی بیوی جیسا ہو گا۔ میں دل سے۔۔۔" وہ آدھا جملہ کہہ کر رک گیا اور اس گروہ میں سے اٹھ کر دور لان میں ایک سایہ دار درخت کے نیچے آنکھیں بند کر کے بیٹھ گیا۔

شاید وہ نروان حاصل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ایک ماہ بعد زبیدہ پھر ڈاکٹر آندھرے کے مطب میں اسی ٹین کے اسٹول پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر آندھرے کے سامنے اس کی نئی رپورٹیں کھلی ہوئی رکھی تھیں۔ وہ بار بار اپنے چشمے کو صاف کرتے، اپنی گول گول آنکھوں کو شیشے کے اندر ہی اندر گھماتے، پھر زبیدہ کو دیکھتے۔ ایک ماہ پہلے والی زبیدہ اور آج کی زبیدہ میں نمایاں فرق تھا۔ نہ جسم پر چربی چڑھی ہوئی تھی، نہ چہرے پر گھبراہٹ، نہ ذہن پر بوجھ اور نہ تھکاوٹ کا احساس۔ وہ ہلکا پھلکا جسم اور ہر فکر سے آزاد ذہن لیے ڈاکٹر کے سامنے اسی ٹین کے بے آرام اسٹول پر بڑے آرام سے بیٹھی ہوئی تھی۔

ڈاکٹر آندھرے خوش بھی تھے اور فکرمند بھی۔ وہ بار بار اپنے چشمے کے شیشے صاف کرتے اور نظریں کبھی زبیدہ پر اور کبھی اس کی بلڈ رپورٹ پر گاڑ دیتے۔ وزن کم ہونے کے باوجود اس کی بلڈ رپورٹ صحیح تصویر پیش نہیں کر رہی تھی۔ لپڈس، کلسٹرول، یورک ایسڈ، ہر چیز پہلے کے مقابلے میں بہت بڑھی ہوئی تھی۔

"ایسا کیوں ہے؟" ڈاکٹر نے خود سے کہا، اور پھر ذرا اونچی آواز میں بولے:

"آپ کے خون میں لپڈس اور کلسٹرول بہت بڑھ گیا ہے۔ یورک ایسڈ بھی پہلے سے زیادہ ہے۔ کیا اس کی کوئی خاص وجہ ہے؟"

"آپ کا مطلب فاسد مادّوں سے ہے؟" زبیدہ نے حکیم قدّوس کی زبان استعمال کی۔

"چلیے فاسد مادّے ہی کہہ لیجیے۔ مگر کیوں؟" ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"میں کیا کہہ سکتی ہوں۔"

"اچھا، تو پھر ایسا کیجیے کہ آپ اپنی واک کا ٹائم کچھ اور بڑھا دیجیے۔"

"بہت اچھا" کہہ کر زبیدہ اسٹول سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے میز پر پڑی اپنی رپورٹوں کو اٹھایا، مروڑی دے کر اپنے پرس میں ٹھونسا اور ڈاکٹر آندھرے کا شکریہ ادا کرتی ہوئی کمرے سے نکل کر باہر آ گئی۔

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اس نے باور کر لیا: جاگنگ پارک میں ایک ماہ تک چالیس منٹ

برسک واک کرتے ہوئے ذہن، آنکھوں اور کانوں کے راستے جو فاسد مادّے معدے میں داخل ہو کر خون میں شامل ہوئے ہیں، یہ سب انھیں کا فتور ہے۔

اس نے اپنی گاڑی کو گھر کی سمت موڑا۔ گھر میں داخل ہونے کے بعد وہ اپنے کمرے میں بچھے ہوئے آرام دہ صوفے میں دھنس کر بیٹھ گئی۔

اب وہ جاگنگ پارک میں برِسک واک کرنے کا پروگرام قطعی طور پر ترک کر چکی تھی۔

ہجرت

ناڈین گورڈیمر

انگریزی سے ترجمہ: نکہت حسن

THE AFRICAN ADVENTURE LIVES ON ... YOU CAN DO IT! THE ULTIMATE SAFARI OR EXPEDITION WITH LEADERS WHO KNOW AFRICA.
(Travel advertisement, *Observer*, 27 November 1988)

اُس رات ہماری اماں بازار گئی تو پھر واپس ہی نہیں آئی۔ پتا نہیں اس کے ساتھ کیا ہوا۔ میرا ابّا بھی ایک دن اسی طرح چلا گیا تھا اور کبھی واپس نہیں آیا۔ لیکن خیر، وہ تو جنگ لڑ رہا تھا۔ یوں تو ہم بھی جنگ ہی کی حالت میں تھے، لیکن بہر حال، ہم تو بچے تھے۔ ہم اپنے دادی دادا کی طرح تھے، جن کے پاس ہتھیار بھی نہیں تھے۔ جن لوگوں سے میرا ابّا لڑ رہا تھا حکومت اُن کو ڈاکو سمجھتی تھی؛ وہ ہر جگہ اُدھم مچائے ہوئے تھے۔ ہم سب ان سے جان بچانے کے لیے اس طرح ڈر کر بھاگتے تھے جیسے مرغیاں کتّوں سے ڈر کر بھاگ رہی ہوں۔ ہماری سمجھ میں نہ آتا تھا کہاں جائیں۔ ہماری ماں اس لیے بازار گئی تھی کہ اسے کسی نے بتایا تھا کہ بازار میں کھانے کا تیل مل رہا ہے۔ ہم اس بات سے بہت خوش تھے، کیوں کہ ہم نے بہت دن سے تیل چکھا تک نہیں تھا۔ اماں کو شاید تیل مل گیا تھا، اسی لیے کسی نے اندھیرے میں اُسے قتل کر دیا اور اس سے تیل چھین لیا۔ یا شاید اس کی ڈاکوؤں سے

مڈبھیڑ ہو گئی ہو گی۔ اگر آپ کا بھی کبھی ڈاکوؤں سے سامنا ہو تو وہ آپ کو بھی مار ڈالیں گے۔ وہ دو بار ہمارے گاؤں میں آئے؛ ہم بھاگ کر جھاڑیوں میں چھپ گئے، اور جب وہ چلے گئے تب جھاڑیوں میں سے نکل کر اپنے گھروں میں واپس آئے اور ہم نے دیکھا کہ وہ ہر چیز کا صفایا کر چکے تھے۔ تیسری دفعہ انھیں گھر میں کوئی چیز نہیں ملی ــــ نہ تیل، نہ کوئی اَور کھانے کی چیز ــــ تب انھوں نے گھر کے چھپّر اور پرال کو آگ لگا دی جس کی وجہ سے ہمارے گھر کی چھتیں زمین پر آ پڑیں۔ میری اماں ٹین کی چادروں کے کچھ ٹکڑے لے آئی جن سے گھر کا کچھ حصہ ڈھک دیا گیا۔ اُس رات ہم اسی چھت کے نیچے بیٹھے اپنی اماں کی واپسی کا انتظار کرتے رہے۔

ہم باہر نکلنے سے ڈرتے تھے، اپنے کام کاج کے سلسلے میں بھی، کیوں کہ ڈاکو واقعی پھر آ گئے تھے۔ ہمارے گھر میں تو خیر نہیں آئے ــــ بغیر چھت کا گھر ان کو انسانوں اور سامان سے خالی نظر آیا ــــ مگر پورے گاؤں میں وہ ڈھٹائی سے دندناتے پھرے۔ ہمیں لوگوں کی چیخ پکار اور بھگدڑ کی آوازیں سنائیں دیتی رہیں۔ ہم تو اپنی اماں کی ہدایت کے بغیر بھاگنے سے بھی ڈرتے تھے۔ میں اپنے بہن بھائیوں میں منجھلی تھی۔ میرا چھوٹا بھائی میرے پیٹ سے ایسے چمٹا ہوا تھا جیسے بندریا کا بچہ اس کے پیٹ سے چمٹا ہوتا ہے، اس طرح کہ اس کے دونوں بازو میری گردن کے گرد تھے اور ٹانگیں میری کمر کے ساتھ لپٹی ہوئی تھیں۔ پوری رات میرا بڑا بھائی گھر کے جلے ہوئے شہتیروں میں سے لکڑی کا ایک ٹکڑا اپنے ہاتھوں میں تھامے رہا تاکہ اگر ڈاکو اس کو دیکھ لیں تو وہ خود کو اُن سے بچا سکے۔

ہم وہاں پورے دن اپنی اماں کا انتظار کرتے رہے۔ مجھے یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ کون سا دن تھا۔ ہمارے گاؤں میں نہ تو کوئی اسکول باقی بچا تھا نہ کوئی گرجا گھر، اس لیے یہ معلوم ہی نہ ہوتا تھا کہ کب اتوار ہے اور کب سوموار۔

جس وقت سورج غروب ہو رہا تھا تو ہماری دادی اور دادا آ گئے۔ کسی نے اُن کو اطلاع دے دی تھی کہ ہم بچے گھر میں اکیلے ہیں، ہماری اماں واپس نہیں آئی۔ میں ہمیشہ دادا سے پہلے دادی کا ذکر کرتی ہوں کیوں کہ یہ اسی طرح ہے: ہماری دادی بڑی لحیم شحیم اور قد کاٹھ والی عورت ہے اور ابھی کچھ زیادہ بوڑھی بھی نہیں ہوئی۔ جبکہ ہمارا دادا اتنا چھوٹا ہے کہ آپ سوچ ہی نہیں سکتے کہ وہ اپنے ڈھیلے ڈھالے پتلون کے کس کونے میں ہے۔ وہ خواہ مخواہ مسکرانے لگتا ہے، بغیر سمجھے کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس کے بال ایسے دکھائی دیتے ہیں جیسے انھیں صابن کے جھاگ سے بھرا ہوا

چھوڑ دیا گیا ہو۔ ہماری دادی ہمیں ــــ یعنی مجھے، چھوٹے بھائی، بڑے بھائی اور دادا کو ــــ اپنے مکان میں لے آئی۔ ہم تمام وقت بہت ڈرے ہوئے رہے (سوائے چھوٹے بھائی کے جو دادی کی پیٹھ پر سوار تھا) کہ کہیں راستے میں ڈاکوؤں سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔ ہم بہت دن تک اپنی دادی کے مکان میں انتظار کرتے رہے ــــ شاید ایک مہینے تک۔ ہم بہت بھوکے تھے اور ہماری اماں بھی نہیں آئی تھی۔ جب ہم اپنی اماں کے انتظار میں تھے، کہ وہ آکر ہمیں یہاں سے لے جائے، اس عرصے میں دادی کے پاس ہمارے لیے کھانے کی کوئی چیز نہ تھی، نہ دادا کے لیے، نہ خود اپنے لیے۔ ایک عورت نے جس کی چھاتیوں میں دودھ تھا، اپنا تھوڑا سا دودھ میرے چھوٹے بھائی کو دیا، حالاں کہ اپنے گھر پر تو وہ ہماری طرح دلیہ ہی کھاتا تھا۔ دادی ہمیں اپنے ساتھ لے کر جنگلی ساگ کی تلاش میں نکلی، لیکن گاؤں کا ہر فرد ہی تلاش میں نکلا ہوا تھا، اس لیے ساگ کا ایک پتا بھی کہیں باقی نہ بچا تھا۔

ہمارا دادا چند نوجوانوں کے پیچھے پیچھے چلتا ہوا ہماری اماں کی تلاش میں نکلا، مگر اسے تلاش نہ کر سکا۔ دادی دوسری عورتوں کے ساتھ مل کر بَین کرنے لگی اور میں بھی اس میں شامل ہو گئی۔ کچھ لوگ تھوڑی سی پھلیاں وغیرہ کھانے کے لیے لے آئے، مگر دو دن بعد پھر وہی فاقہ تھا۔ دادا کے پاس تین بھیڑیں، ایک گائے اور ترکاریوں کا ایک باغیچہ ہوا کرتا تھا۔ لیکن بھیڑیں اور گائے تو بہت دن ہوئے ڈاکو لے گئے تھے ــــ وہ بھی تو آخر کو بھوکے ہی تھے ــــ اور جب بوائی کا وقت آیا تو دادا کے پاس بیج ہی نہ تھے۔

آخر ان دونوں نے طے کر ہی لیا ــــ بلکہ طے تو دادی نے کیا؛ دادا لاکھ چیخا چلّایا اور ادھر اُدھر پیر پٹختا پھرا، لیکن دادی نے ذرا پروا نہ کی ــــ کہ ہمیں یہاں سے چل دینا چاہیے۔ ہم بچے بہت خوش تھے۔ ہم ایسی جگہ سے چلے ہی جانا چاہتے تھے جہاں نہ اماں تھی اور نہ کھانا تھا۔ ہم وہاں جانا چاہتے تھے جہاں ڈاکو تو نہ ہوں لیکن کھانا ہو۔ ہم یہ سوچ سوچ کر ہی خوش تھے کہ کہیں بہت دور کوئی ایسی جگہ بھی ہے۔

دادی نے اپنی گرجاگھر پہن کر جانے والی پوشاک دے کر بدلے میں کچھ خشک مکئی کے دانے لے لیے اور ان دانوں کو اُبال کو ایک پرانے کپڑے میں باندھ لیا، اور جب ہم وہاں سے روانہ ہوئے تو وہ دانے ہمارے پاس تھے۔ دادی کا خیال تھا کہ ہمیں دریا کا پانی مل جائے گا لیکن ہمیں کوئی دریا وریا نہ ملا۔ اتنی سخت پیاس لگی کہ ہمیں واپس مڑنا پڑا۔ لیکن ہم واپس دادی کے گھر

نہیں آئے بلکہ ایک ایسے گاؤں میں رک گئے جہاں پانی کا بمبا تھا۔ دادی نے اپنی ٹوکری کھولی جس میں اس نے کپڑے اور مکئی کے دانے ٹھونس رکھے تھے اور اس بار اپنے جوتے بیچ کر پانی کے لیے ایک بڑا پلاسٹک کا ڈرم خرید لیا۔ میں نے کہا، "گوگو! اب تم بغیر جوتوں کے گرجاگھر کیسے جاؤ گی؟" لیکن اس نے کہا کہ سفر لمبا ہے اور ہم زیادہ سامان نہیں اٹھا سکتے۔ اس گاؤں میں ہمیں اور لوگ بھی ملے جو اس جگہ کو چھوڑ کر جا رہے تھے۔ ہم بھی ان کے ساتھ مل گئے کیوں کہ وہ سب ہمارے مقابلے میں اپنی منزل سے زیادہ واقف دکھائی دیتے تھے۔

وہاں پہنچنے کے لیے ہمیں کُروگر پارک سے گزرنا تھا۔ ہم کروگر پارک کے بارے میں پہلے سے جانتے تھے ــــ ایک طرح کی پوری کی پوری حیوانوں کی مملکت: ہاتھی، شیر، گیدڑ، لکڑبگھے، تیندوے، مگرمچھ، غرض ہر قسم کے جانور۔ ان میں سے کچھ تو ہمارے اپنے ملک میں بھی تھے، خاص طور پر لڑائی سے پہلے۔ (ہمارے دادا کو سب یاد ہے؛ ہم بچے تو اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔) لیکن ڈاکوؤں نے سارے ہاتھیوں کو مار ڈالا تھا اور ان کے دانت بیچ دیے تھے۔ اور ڈاکوؤں نے اور ہمارے سپاہیوں نے سارے ہرن بھی کھا لیے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی دونوں ٹانگوں سے معذور تھا۔ اس کی ٹانگیں ہمارے دریا میں رہنے والے مگرمچھ نے کھا لی تھیں۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہمارا ملک بہرحال انسانوں کا ملک ہے نہ کہ جانوروں کا۔ ہمیں کروگر پارک کے متعلق معلومات تھیں کیوں کہ ہمارے کچھ لوگ اپنے گھروں سے نکل کر ایسی جگہوں پر کام کرنے جاتے تھے جہاں گورے لوگ جانوروں کو دیکھنے کے لیے آ کر ٹھہرتے تھے۔

ہم نے پھر اپنا سفر شروع کیا۔ قافلے میں کچھ عورتیں تھیں اور کچھ میری طرح کے بچے۔ جب عورتیں تھک جاتیں تو چھوٹے بچے ان کی پیٹھ پر سوار ہو جاتے تھے۔ ایک آدمی ہمیں کروگر پارک کی طرف لے کر چلا۔ "کیا پارک آ گیا؟ کیا پارک آ گیا؟" میں دادی سے بار بار پوچھ رہی تھی۔ دادی کے جواب نہ دینے پر اس آدمی نے بتایا کہ ابھی نہیں آیا۔ اس نے ہمیں یہ بھی بتایا کہ باڑھ کے گرد سے گھوم کر جانے میں بہت لمبا راستہ طے کرنا ہوگا۔ باڑھ کے بارے میں اس نے یہ بھی کہا کہ اس کو ہاتھ لگاتے ہی تم مر جاؤ گے؛ اس کو چھوتے ہی تمہاری کھال جل بھن کر کباب ہو جائے گی، بالکل اس طرح جیسے شہروں میں بجلی کے کھمبوں کے اوپر تنے ہوئے تاروں کو چھونے سے ہوتا ہے۔ میں نے مِشن ہسپتال میں ایک لوہے کے ڈبّے پر سر کا وہ نشان بنا دیکھا تھا جس پر نہ

آنکھیں تھیں نہ کھال اور نہ بال۔ بعد میں یہ ہسپتال بھی دھماکے سے اُڑ گیا۔

جب میں نے پھر وہی سوال کیا تو پتا چلا کہ ہم ایک گھنٹے سے کروگر پارک کے اندر ہی تو چل رہے ہیں۔ مگر وہ تو دیکھنے میں ان جھاڑیوں کی طرح لگتا تھا جن میں ہم پورے دن چلتے رہے تھے اور ہمیں کوئی جانور بھی دکھائی نہیں دیا، بس بندر اور چڑیاں جو ہمارے اپنے گھر کے آس پاس بھی ہوتی تھیں، اور ایک کچھوا جو بھاگ کر ہم سے دور نہیں گیا۔ میرا بڑا بھائی اور دوسرے لڑکے کچھوے کو اُس آدمی کے پاس لے گئے تاکہ اسے مار کر پکایا اور کھایا جا سکے۔ اس نے کچھوے کو چھوڑ دیا کیوں کہ اس کا کہنا تھا کہ وہاں آگ نہیں جلائی جا سکتی۔ جب تک ہم پارک میں تھے، آگ نہیں جلا سکتے تھے، ورنہ دھویں سے ہمارا اتا پتا چل جاتا اور پولیس اور پہرے دار آکر ہمیں واپس وہیں پہنچا دیتے جہاں سے ہم چلے تھے۔ اس آدمی نے کہا کہ ہمیں جانوروں کے درمیان جانوروں کی طرح چلنا ہوگا، یعنی سڑک اور گورے لوگوں کے خیموں سے دور ہی دور۔ اسی لمحے مجھے ایک آواز سنائی دی ___ مجھے یقین ہے کہ یہ آواز سب سے پہلے میں نے ہی سنی ___ جیسے ٹہنیاں چٹخ رہی ہوں اور کوئی گھاس کو روندتا چلا آ رہا ہو۔ اور میری قریب قریب چیخ نکل گئی کیوں کہ میں نے سوچا کہ شاید پولیس والے اور پہرے دار ہوں جن سے وہ آدمی ہمیں ہوشیار رہنے کو کہہ رہا تھا، اور انھوں نے ہمیں دیکھ لیا ہو۔ مگر وہ تو ہاتھی نکلا۔ اس کے پیچھے دوسرا ہاتھی، اور اس کے پیچھے بہت سارے ہاتھی جیسے بڑے بڑے کالے دھبے پیڑوں کے درمیان ہر طرف چل پھر رہے ہوں۔ وہ اپنی سونڈوں میں موپین کے درخت کی لال پتّیوں کو لپیٹ کر اپنے منھ میں ٹھونس رہے تھے۔ ہاتھیوں کے بچے اپنی ماؤں سے چمٹے ہوئے چل رہے تھے۔ کچھ بڑے بچے آپس میں اس طرح دھینگا مشتی کر رہے تھے جیسے میرا بڑا بھائی اور اس کا دوست ___ بس فرق یہ تھا کہ وہ ہاتھوں کے بجائے سونڈوں سے لڑ رہے تھے۔ مجھے اتنا مزہ آ رہا تھا کہ ڈرنا یاد تک نہ رہا۔ اس آدمی نے کہا جب تک ہاتھی گزر نہیں جاتے ہم خاموش دَم سادھے کھڑے رہیں۔ مگر ہاتھی آہستہ آہستہ، مزے مزے سے گزر رہے تھے، کیوں کہ ہاتھی اتنے لحیم شحیم ہوتے ہیں کہ ان کو کسی سے ڈر کر بھاگنے کی ضرورت ہی نہیں۔

ہاں ہرن ہم سے ڈر کر اِدھراُدھر ضرور بھاگتے تھے۔ وہ ہوا میں اتنی اونچی قلانچیں بھرتے مانو اُڑ رہے ہوں، اور جنگلی سوَر تو ہماری آہٹ سنتے ہی بالکل ساکت ہو گئے اور پھر یوں لہریے بناتے ہوئے بھاگے جیسے ہمارے گاؤں میں ایک لڑکا اپنی سائیکل چلاتا تھا جو اس کے باپ نے اسے لا کر دی تھی۔ ہم جانوروں کے پیچھے پیچھے ان کی پانی پینے کی جگہ تک جاتے اور جانوروں کے جانے کے

بعد قریب جا کر پانی پیتے۔ ہمیں کبھی پیاسا نہیں رہنا پڑا لیکن جانور ہر وقت کچھ نہ کچھ کھاتے ہی رہتے تھے۔ جب دیکھو کبھی گھاس پھوس، کبھی پیڑ پودے، کبھی پیڑوں کی جڑیں اور چھال کھا رہے ہوتے اور ادھر ہمارے پاس کھانے کو کچھ بھی نہیں تھا۔ مکئی کے دانے تک تو ختم ہو چکے تھے۔ اگر ہمارے کھانے کو کچھ تھا تو وہ لنگوروں کی غذا تھی، یعنی چھوٹے چھوٹے اور چیونٹیوں سے بھرے انجیر جو دریا کے کنارے پیڑوں کی شاخوں پر لٹکے ہوئے تھے۔ سچ مچ جانوروں کی طرح رہنا سہنا بہت ہی مشکل کام تھا۔

دن میں جب بہت زیادہ گرمی ہوتی تو شیر ہمیں سوتے ہوئے ملتے۔ ان کا رنگ گھاس کے رنگ سے ملتا جلتا تھا۔ پہلے پہل تو ہمیں وہ دکھائی ہی نہ دیے، لیکن اُس آدمی کو نظر آ گئے اور وہ ہمیں اس جگہ سے بہت دور جہاں شیر سو رہے تھے، الٹی طرف واپس لے گیا۔ میرا بھی شیروں کی طرح سونے کو بہت جی چاہتا تھا۔ میرا بھائی برابر دُبلا ہو رہا تھا لیکن بھاری ویسا کا ویسا ہی تھا اور جب دادی میرے بھائی کو میری پیٹھ پر لادنے کے لیے میری طرف دیکھتی تو میں کوشش کرتی کہ اُس کی طرف نہ دیکھوں۔ میرے بڑے بھائی نے بھی بولنا بند کر دیا تھا اور جب ہم آرام کے لیے لیٹتے تو اسے ہلا ہلا کر جگانا پڑتا، جیسے دادا کی طرح اسے بھی کچھ سنائی نہ دیتا ہو۔ میں نے دادی کے منہ پر مکھیاں رینگتی ہوئی دیکھیں جنھیں وہ اُڑا ہی نہیں رہی تھی۔ مجھے بہت ڈر لگا۔ میں نے پام کی ایک شاخ لے کر ان کو اُڑایا۔

ہم دن کے وقت بھی چلتے اور رات کو بھی۔ اب ہمیں گورے لوگوں کے خیمے دکھائی دینے لگے تھے جہاں آگ جل رہی تھی اور کھانا بھی پک رہا تھا اور دھویں اور گوشت دونوں کی خوشبوئیں آ رہی تھیں۔ ہم نے لکڑبگھوں کو ان خوشبوؤں کے پیچھے جھاڑیوں میں سے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ ان کی کمریں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے وہ کسی بات پر شرمسار ہو رہے ہوں۔ جب کوئی لکڑبگھا اپنی گردن موڑتا تو اس کی آنکھیں ایسی ہی لگتیں جیسی ہماری آنکھیں رات کے اندھیرے میں ایک دوسرے کو دیکھتی ہوئی لگتی ہوں۔ ہوا کے ساتھ ساتھ باڑھ سے گھرے ہوئے احاطوں میں سے ہماری زبان میں بول چال کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہاں کیمپوں میں کام کرنے والے رہتے تھے۔ رات کے وقت ہم میں سے ایک عورت مدد مانگنے ان کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس نے کہا کہ وہ تو ہمیں کچرے کے ڈرم میں سے بھی کھانے کی چیزیں دے سکتے ہیں۔ آخر اس نے رونا شروع کر دیا اور

دادی کو اسے سنبھالنا پڑا اور اس کا منہ اپنے ہاتھ سے بند بھی کرنا پڑا۔ اُس آدمی نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ ہمیں کروگر پارک میں کام کرنے والے اپنے لوگوں سے دور دور رہنا ہوگا۔ اگر وہ ہماری مدد کرتے تو اپنی نوکریوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ اگر ان کی نظر ہم پر پڑ جاتی تو وہ بس اتنا کر سکتے تھے کہ ظاہر کریں کہ ہم وہاں ہیں ہی نہیں اور انھوں نے تو خالی خولی جانور دیکھے تھے۔

کبھی کبھی رات کو ہم سونے کے لیے تھوڑی دیر کو رک جاتے۔ ہم ایک دوسرے سے سَٹ کر سوتے تھے۔ مجھے پتا نہیں وہ کون سی رات تھی — کیوں کہ ہم ہر وقت بس چلتے ہی چلے جا رہے تھے — جب ہم نے کہیں بہت ہی قریب شیروں کی اواز سنی۔ ایسی آواز نہیں جیسے شیر دور سے دہاڑ رہے ہوں، بلکہ کچھ اس طرح جیسے سانس پھولنے کی آواز ہوتی ہے۔ بالکل ویسی جیسی دوڑنے کے بعد ہماری نکلتی ہے۔ لیکن ہانپنے کی یہ آواز کچھ مختلف تھی کیوں کہ وہ دوڑ نہیں رہے تھے۔ کہیں نزدیک ہی کسی انتظار میں کھڑے تھے۔ ہم کھسک کر ایک دوسرے کے اور قریب آ گئے۔ جو کناروں پر تھے ان کی کوشش تھی کہ اندر گھس کر درمیان میں پہنچ جائیں۔ میں بالکل ایک عورت سے لگ کر کھڑی تھی جس کی بدن سے بدبو آ رہی تھی۔ حالاں کہ وہ ڈر رہی تھی لیکن میں خوشی سے اس سے چمٹ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے خدا سے دعا مانگی کہ شیر کنارے پر کھڑے کسی ایک کو پکڑ لیں لیکن یہاں سے چلے جائیں۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں تاکہ اس درخت کو نہ دیکھوں جہاں سے کوئی شیر کود کر ہمارے درمیان آ سکتا تھا، بالکل بیچ میں جہاں میں کھڑی تھی۔ لیکن وہ آدمی اُچھل کر کھڑا ہو گیا اور ایک سوکھی ٹہنی پیڑ پر زور زور سے مارنے لگا۔ ہم سے تو اس نے کوئی بھی آواز نہ نکالنے کو کہا تھا مگر خود چیخ رہا تھا۔ وہ شیروں پر ایسے چیخ رہا تھا جیسے ہمارے گاؤں میں ایک نشیارا یوں ہی ہوا میں منہ اٹھا کر چینختا رہتا تھا۔ شیر آخر چلے گئے کیوں کہ ہم نے ان کے دہاڑنے اور چینخنے کی آوازیں بہت دور سے آتی ہوئی سنیں۔

***

ہم تھک گئے تھے۔ بہت ہی زیادہ تھک گئے تھے۔ جب راستے میں ہم کوئی دریا پار کرتے تو میرے بڑے بھائی اور ایک اَور آدمی کو میرے دادا کو اٹھا کر ایک پتھر سے دوسرے پتھر تک لے جانا پڑتا۔ میری دادی بہت طاقت ور ہے لیکن اس کے پیروں سے خون بہہ رہا تھا۔ ہم اتنے تھک گئے تھے کہ سر پر ٹوکری اٹھا کر بھی نہیں چل سکتے تھے۔ ہم کچھ بھی تو نہیں اٹھا سکتے تھے، سوائے اپنے چھوٹے بھائی کے۔ ہم نے اپنی ساری چیزیں ایک جھاڑی کے نیچے چھوڑ دیں۔ "ہم

خود ہی وہاں پہنچ جائیں تو بہت ہے،'' دادی نے کہا۔ پھر ہم نے بھوک کے مارے کچھ جنگلی پھل کھا لیے جو ہمارے گھر کے آس پاس نہیں ہوتے تھے۔ اس سے ہم سب کے پیٹ خراب ہو گئے اور دست آنے لگے۔ اُس وقت ہم ایسی گھاس میں سے گزر رہے تھے جو ہاتھی گھاس کہلاتی تھی اور تھی بھی ہاتھی جتنی اونچی۔ تب ہمارے پیٹوں میں مروڑ شروع ہوئی اور ہمارا دادا تو میرے چھوٹے بھائی کی طرح سب کے سامنے بیٹھ کر فارغ بھی نہیں ہو سکتا تھا، اس لیے وہ فارغ ہونے اکیلا ہی گھاس کے اندر چلا گیا۔ ''چلتے رہو، چلتے رہو،'' وہ آدمی ہم سے برابر کہتا رہتا تھا لیکن ہم نے اس سے دادا کے لیے انتظار کرنے کو کہا۔

اب ہر شخص دادا کے واپس آنے کا انتظار کرنے لگا لیکن وہ اب آیا نہ جب۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ہمارے کانوں میں کیڑے مکوڑوں کے بھنبھنانے کی آوازیں آرہی تھیں اس لیے ہم گھاس کی سرسراہٹ نہیں سن سکتے تھے جس سے پتا چلتا کہ وہ واپس آرہا ہے۔ ہم اسے دیکھ بھی نہیں سکتے تھے کیوں کہ گھاس بہت اونچی تھی اور دادا بہت چھوٹا۔ لیکن ہمیں یقین تھا کہ وہ اپنے ڈھیلے پتلون اور پھٹی ہوئی قمیص میں یہیں کہیں ہو گا۔ ہماری دادی اس کی قمیص بھی نہ سی سکی تھی کیوں کہ دھاگا ہی نہیں تھا۔ ہمیں معلوم تھا کہ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہو گا کیوں کہ وہ کمزور تھا اور آہستہ چلتا تھا۔ ہم اس کی تلاش میں نکلے لیکن چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تاکہ گھاس میں کہیں ہم بھی ایک دوسرے کی نظروں سے اوجھل نہ ہو جائیں۔ گھاس ہماری ناک اور آنکھوں میں گھسی جا رہی تھی۔ ہم دبی دبی آوازمیں دادا کو پکار رہے تھے لیکن اس کے کانوں میں جو جگہ سماعت کے لیے بچی تھی وہ شاید کیڑے مکوڑوں کی بھنبھناہٹ نے پُر کر دی تھی۔ ہم اسے ڈھونڈ ڈھونڈ کر تھک گئے لیکن وہ نہ ملا۔ ہم پوری رات اس اونچی گھاس پر پڑے رہے۔ نیند میں مَیں نے اسے ایک جگہ گُڑمڑی مارے پڑا دیکھا جو اس نے خود کھودی تھی جیسے ہرنیاں اپنے بچوں کو چھپانے کے لیے کھودتی ہیں۔

جب میری آنکھ کھلی تب بھی اس کا کہیں پتا نہ تھا۔ ہم نے پھر اس کی تلاش شروع کی۔ ہم نے گھاس پر چل چل کر ایسے راستے بنا دیے تھے کہ اگر ہم اسے نہیں ڈھونڈھ سکتے تھے تو وہ آسانی سے ہمیں تلاش کر سکتا تھا۔ اس پورے دن ہم بیٹھے اس کا انتظار کرتے رہے۔ جب سورج سر پر ہو تو ہر طرف خاموشی چھا جاتی ہے۔ اس کی شعاعیں سر میں گھسی جاتی ہیں، چاہے آپ جانوروں کی طرح پیڑ کے نیچے لیٹے ہوئے ہوں۔ میں چت لیٹی ہوئی چونچوں اور بَرہنہ گردنوں والے ان بدصورت پرندوں کو دیکھ رہی تھی جو ہمارے اوپر چاروں طرف اُڑ رہے تھے۔ ہم انھیں اُس

وقت بھی دیکھتے ہوئے گزرے تھے جب وہ مردہ جانوروں کی ہڈیاں کرید رہے تھے اور ان ہڈیوں میں ہمارے کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں بچا تھا۔ وہ اوپر گول گول چکر لگا رہے تھے۔ کبھی نیچے آکر اُڑنے لگتے اور کبھی اوپر چلے جاتے۔ میں نے دیکھا کہ ان کی گردنیں کبھی ایک طرف اور کبھی دوسری طرف مڑ جاتیں۔ وہ اڑتے ہوئے مسلسل چکر لگا رہے تھے۔ میں نے دادی کو دیکھا۔ وہ میرے چھوٹے بھائی کو گود میں لیے بیٹھی تھی اور وہ بھی ان پرندوں کو دیکھ رہی تھی۔

شام کے وقت وہ آدمی دادی کے پاس آیا اور اس سے کہنے لگا کہ باقی لوگوں کو اب روانہ ہو جانا چاہیے۔ اس نے کہا کہ اگر ان کے بچوں کو کھانے کو کچھ نہ ملا تو وہ بہت جلد مر جائیں گے۔

دادی کچھ نہ بولی۔

''میں جانے سے پہلے تمھیں کچھ پانی لادوں گا،'' وہ آدمی بولا۔

دادی نے میری طرف، میرے بڑے بھائی کی طرف اور اپنی گود میں لیٹے ہوئے میرے چھوٹے بھائی کی طرف دیکھا۔ ہم دوسرے لوگوں کو جانے کے لیے کھڑے ہوتے دیکھ رہے تھے۔ مجھے یقین نہ آیا کہ ہمارے ارد گرد کی وہ گھاس جہاں سب لوگ تھے خالی ہو جائے گی۔ ہم اس جگہ یعنی کروگر پارک میں اکیلے رہ جائیں گے اور پولیس یا درندے ہمارا کھوج لگا لیں گے۔ آنسو میری آنکھوں سے بہہ بہہ کر ناک سے میرے ہاتھوں پر ٹپکنے لگے لیکن دادی نے کوئی توجہ نہ دی۔ وہ اٹھی اور اپنی ٹانگیں یوں پھیلالیں جیسے جلانے والی لکڑیاں اٹھاتے وقت پھیلاتی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے کے ساتھ میرے بھائی کو اپنی پیٹھ پر لادا اور ایک کپڑے سے اسے اپنے اوپر کس کر باندھ لیا۔ اس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور اس کی بڑی بڑی چھاتیاں، جن میں میرے بھائی کے لیے کچھ بھی نہ تھا، نظر آرہی تھیں۔ اس نے کہا، ''چلو۔''

تب ہم اونچی گھاس والی جگہ کو چھوڑ کر آگے چل دیے۔ وہ جگہ پیچھے رہ گئی، ہم اُس ادمی اور باقی سب لوگوں کے ساتھ چل پڑے۔ ہم دوبارہ چلنے لگے۔

***

ایک بڑا سا خیمہ ہے ـــــ کسی گرجا گھر یا اسکول سے بھی بڑا جو زمین میں گڑا ہوا ہے۔ جب ہم بہت چلنے کے بعد یہاں پہنچے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ وہ جگہ ہوگی۔ اس قسم کی جگہ ہم نے اُس وقت بھی دیکھی تھی جب ہماری اماں ہمیں ساتھ لے کر شہر گئی تھی کیوں کہ اس نے سنا تھا کہ ہمارے فوجی وہاں آئے ہوئے ہیں اور وہ ان سے ہمارے ابا کا اتاپتا پوچھنا چاہتی تھی۔ اُس

خیمے میں لوگ دعا مانگ رہے تھے اور گا رہے تھے۔ یہ خیمہ بھی اُسی خیمے کی طرح نیلا اور سفید ہے لیکن یہ دعا مانگنے یا گانے کے لیے نہیں ہے۔ ہم یہاں ان دوسرے لوگوں کے ساتھ رہتے ہیں جو ہمارے ملک سے آئے ہیں۔ مطب کی نرس کہتی ہے کہ چھوٹے بچوں کو چھوڑ کر ہم کل دو سو افراد ہیں۔ کچھ نئے پیدا ہونے والے بچے بھی ہیں جو اُس دوران پیدا ہوئے جب ہم کروگر پارک میں سے گزر رہے تھے۔

دن میں بھی جب سورج چمکتا ہے خیمے کے اندر اندھیرا ہی رہتا ہے اور یوں لگتا ہے جیسے پورا گاؤں یہیں آ بسا ہو۔ اندر مکانوں کے بجائے ہر خاندان نے اپنے رہنے کی جگہ کو بوریوں یا گتے کے بکسوں سے — جو کچھ بھی ہاتھ لگے — گھیر لیا ہے تاکہ دوسرے خاندان کو جتا سکیں کہ یہ ان کی جگہ ہے اور اس جگہ میں کوئی اَور داخل نہ ہو۔ حالاں کہ یہاں نہ کوئی دروازہ ہے نہ کھڑکی اور نہ کوئی چھپر اور کوئی بڑا اگر کھڑا ہو کر دیکھے تو ہر ایک کے گھر کے اندر جھانک سکتا ہے۔ کچھ لوگوں نے تو پتھروں کو پیس کر رنگ بھی گھول لیا اور بوریوں پر تصویریں بنا لیں۔

ویسے یہاں چھت تو ضرور ہے — اوپر بہت دور خیمے کا سائبان۔ بالکل آسمان کی طرح۔ کسی بڑے سے پہاڑ کی طرح جس کے اندر ہم رہ رہے ہوں۔ خیمے کی دراڑوں میں سے گرد کے راستے نیچے کی طرف آتے دکھائی دیتے ہیں جو اتنے چوڑے ہیں کہ لگتا ہے ہم ان پر چڑھ سکتے ہیں۔ خیمے کی چھت بارش کے پانی کو اوپر سے آنے سے تو روک لیتی ہے لیکن پانی کے نیچے سے بہہ بہہ کر اندر آ جاتا ہے اور ہمارے اپنے بنائے ہوئے مکانوں کی گلیوں میں پھیل جاتا ہے — یہ گلیاں اتنی تنگ ہیں کہ ان میں ایک وقت میں ایک ہی آدمی چل کر جا سکتا ہے — اور چھوٹے بچے، جیسے میرا چھوٹا بھائی ہے، کیچڑ میں کھیلنے لگتے ہیں۔ ایسے میں ان بچوں پر سے پھلانگ کر ہی گزرا جا سکتا ہے۔ میرا چھوٹا بھائی اب کچھ کھیلتا ہی نہیں۔ دادی اسے ہر سوموار کو، جب ڈاکٹر آتا ہے، مطب لے جاتی ہے۔ نرس کہتی ہے کہ اس کے سر میں کچھ خرابی ہے۔ اس کے خیال میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم جہاں سے آئے ہیں وہاں ہمیں کم خوراک ملتی تھی۔ جنگ کی وجہ سے یا شاید اس وجہ سے کہ ہمارا ابا وہاں نہیں تھا۔ یا پھر شاید اس وجہ سے کہ وہ کروگر پارک سے گزرنے کے دوران پورے وقت بھوکا رہا تھا۔ اسے تو بس دن بھر دادی کے پیٹ پر یا گود میں پڑے رہنا یا اس سے ٹیک لگائے بیٹھے رہنا ہی اچھا لگتا ہے۔ وہ وہاں سے ہمیں تکتا رہتا ہے۔ وہ کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر اس سے بولا نہیں جاتا۔ جب میں اس کے گدگدی کرتی ہوں تو وہ صرف مسکرا دیتا ہے۔ مطب سے اسے

کھلانے کے لیے ایک سفوف ملا جسے گھول کر اس کے لیے دلیہ بنایا جاتا ہے اور شاید کسی دن وہ ٹھیک ہو ہی جائے۔

جب ہم یہاں پہنچے تب ہماری ــــ میری اور میرے بڑے بھائی کی ــــ حالت بھی بالکل اسی کی طرح تھی۔ مجھے کچھ زیادہ یاد نہیں آرہا۔ خیمے کے پاس گاؤں میں رہنے والے لوگ ہمیں مطب میں لے گئے تھے۔ یہاں پہنچنے کے بعد وہیں جا کر اپنا نام لکھوانا پڑتا ہے ــــ کہ ہم وہاں سے نکل آئے ہیں، کروگر پارک کے راستے۔ ہم گھاس پر بیٹھ گئے اور ہر چیز گڈمڈ ہوتی ہوئی لگ رہی تھی۔ ایک نرس جو اپنے سیدھے بنے ہوئے بالوں اور اونچی ایڑی کے خوب صورت سینڈلوں کی وجہ سے بہت پیاری لگ رہی تھی، ہمارے لیے یہی خاص سفوف لے کر آئی اور بتایا کہ ہم یہ سفوف پانی میں گھول کر آہستہ آہستہ پییں۔ ہم نے پیکٹ کو دانتوں سے پھاڑا اور سفوف کو چوس لیا۔ کچھ دوسرے بچے جو ہمارے ساتھ ہی آئے تھے الٹیاں کرنے لگے۔ مجھے بھی اپنے پیٹ کے اندر کچھ حرکت سی محسوس ہوئی۔ سفوس سانپ کی طرح رینگتا ہوا اندر جاتا محسوس ہو رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجھے ہچکیاں آنا شروع ہوئیں جن سے میرا بُرا حال ہو گیا۔ دوسری نرس نے ہمیں مطب کے برآمدے میں قطار بنا کر کھڑے ہونے کو کہا مگر ہم کھڑے نہ ہو سکے۔ ہم اِدھر اُدھر ایک دوسرے پر گرے ہوئے بیٹھے تھے۔ نرسوں نے ہر ایک کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور بازو میں سوئیاں لگائیں۔ دوسری سوئیوں سے ہمارا خون لے کر چھوٹی چھوٹی شیشیوں میں ڈالا۔ یہ سب بیماری کی روک تھام کے لیے کیا جا رہا تھا، مگر میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ جب بھی میری آنکھ لگتی مجھے ایسے معلوم ہوتا کہ میں لمبی گھاس میں بس چلے ہی جا رہی ہوں۔ مجھے ہاتھی بھی دکھائی دیتے۔ مجھے یہ احساس نہیں تھا کہ ہم یہاں پہنچ گئے ہیں۔

لیکن دادی اب بھی طاقتور تھی۔ وہ کھڑی بھی ہو سکتی تھی اور اسے لکھنا بھی آتا تھا اس لیے اس نے ہمارے لیے بھی دستخط کیے۔ ہماری دادی نے خیمے کی ایک دیوار کے بالکل ساتھ یہ جگہ لی۔ یہ خیمے میں بہترین جگہ ہے۔ یہاں بارش کا پانی تو بے شک اندر آتا ہے مگر جب موسم اچھا ہو تو ہم پردہ اٹھا سکتے ہیں اور سورج ہمارے سامنے ہوتا ہے اور سیلن کی بدبو جلد ہی ختم ہو جاتی ہے۔ دادی یہاں ایک عورت کو جانتی ہے جس نے اسے بتایا کہ سونے کے واسطے چٹائی بنانے کے لیے عمدہ گھاس کہاں سے لی جائے اور دادی نے ہمارے لیے چٹائیاں بنا دیں۔ مہینے میں ایک بار کھانے کی چیزوں سے بھرا ہوا ٹرک مطب میں آتا ہے۔ دادی اپنا دستخط کیا ہوا کارڈ لے کر وہاں جاتی ہے اور

اس کے کارڈ میں چھید ہونے کے بعد ہمیں مکئی کے دانوں کی ایک بوری مل جاتی ہے۔ بوریوں کو خیمے تک لانے کے لیے وہاں ایک پہیے والی ریڑھیاں ہیں۔ میرا بڑا بھائی بوری اس پر رکھ کر لے آتا ہے۔ واپسی پر وہ اور دوسرے لڑکے خالی ریڑھیوں کو دھکیلتے ہوئے مطب کی طرف دوڑ لگاتے ہیں۔ کبھی کبھی خوش قسمتی سے اسے کوئی ایسا شخص مل جاتا ہے جس نے گاؤں سے بیئر کی بوتلیں خریدی ہوں اور اسے ان بوتلوں کو پہنچانے کے کچھ پیسے مل جاتے ہیں — ویسے اس کی اجازت نہیں ہے۔ ریڑھیوں کو سیدھا نرسوں کے پاس واپس پہنچانا ہوتا ہے۔ میرا بھائی ان پیسوں سے شربت خریدتا ہے اور میرے مانگنے پر تھوڑا سا شربت مجھے بھی دے دیتا ہے۔ مہینے میں ایک اور دن گرجاگھر سے کپڑوں کا ایک گٹھر مطب کے صحن میں آتا ہے۔ دادی کے پاس ایک اور کارڈ ہے جس میں چھید کروانے کے بعد ہم وہاں سے اپنی پسند کا کوئی لباس لے سکتے ہیں۔ میرے پاس دو جوڑے، دو پتلون اور ایک جرسی ہو گئی ہے اور اب میں اسکول جا سکتی ہوں۔

گاؤں والوں نے ہمیں اپنے اسکول میں داخلہ لینے کی اجازت دے دی ہے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ وہ ہماری ہی زبان بولتے ہیں۔ دادی کہتی ہیں شاید اسی وجہ سے انھوں نے ہمیں اپنے علاقے میں رہنے دیا ہے۔ بہت دن پہلے، ہمارے آباواجداد کے وقتوں میں، ایسی کوئی باڑھ نہیں تھی جس کو چھونے سے لوگ مر جاتے ہیں۔ نہ اُن کے اور ہمارے درمیان کوئی کروگر پارک ہی تھا۔ ہم سب ایک تھے، اپنے گاؤں سے لے کر یہاں تک جہاں ہم اب آ گئے ہیں۔ اور ہمارا ایک ہی بادشاہ تھا۔

***

ہمیں اس خیمے میں رہتے رہتے بہت دن ہو گئے ہیں — اب میں گیارہ سال کی ہوں اور میرا چھوٹا بھائی لگ بھگ تین سال کا، حالاں کہ وہ بہت چھوٹا سا ہے۔ صرف اس کا سر بہت بڑا ہے۔ وہ ابھی تک پوری طرح ٹھیک نہیں ہوا۔ اب کچھ لوگوں نے خیمے کے ارد گرد کی خالی زمین کو کھود کر وہاں مکئی اور کرم کلا بو دیا ہے۔ بوڑھے لوگوں نے شاخیں جوڑ جوڑ کر اپنی کیاریوں کے گرد باڑھیں بنالی ہیں۔ کسی کو شہر میں جا کر کام کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن کچھ عورتوں نے گاؤں ہی میں کام تلاش کر لیا ہے اور اب وہ کچھ خریداری بھی کر سکتی ہیں۔ دادی اب بھی طاقتور ہے اس لیے ابھی ایسی جگہ جہاں لوگ مکان بنا رہے ہوں، کام ڈھونڈھ ہی لیتی ہے — اس گاؤں میں لوگ اینٹوں اور سیمنٹ سے بہت خوب صورت مکان بناتے ہیں۔ ہمارے گاؤں کی طرح مٹی اور گارے سے

نہیں۔ دادی لوگوں کے لیے اینٹیں اور پتھروں کی ٹوکریاں سر پر ڈھو کر لے جاتی ہے۔ اب اس کے پاس شکر، چائے، دودھ اور صابن خریدنے کے پیسے ہوتے ہیں۔ اسٹور والوں نے اسے ایک کیلنڈر بھی دیا جو اس نے خیمے میں ہمارے پاس کے پردے پر ٹانگ دیا ہے۔ میں اسکول میں بہت تیز ہوں۔ اس نے لوگوں کے پھینکے ہوئے اشتہاروں کے صفحے جمع کر کے میری کتابوں پر چڑھا دیے ہیں۔ وہ ہر سہ پہر کو مجھے اور بڑے بھائی کو اسکول کا کام پورا کرنے کے لیے بٹھا دیتی ہے، اس سے پہلے کہ اندھیرا ہو جائے، کیوں کہ یہاں خیمے میں صرف سٹ کر لیٹنے بھر کی جگہ ہے، جیسے ہم کروگر پارک سے گزرتے ہوئے لیٹا کرتے تھے، اور موم بتیاں بہت مہنگی ہیں۔ دادی ابھی تک اپنے لیے جوتے نہیں خرید سکی جنھیں پہن کر گرجا گھر جا سکے لیکن اس نے میرے اور بڑے بھائی کے لیے اسکول کے کالے جوتے اور ان پر کرنے کے لیے پالش خرید لی ہے۔ ہر صبح جب خیمے میں لوگ بیدار ہو رہے ہوتے ہیں، بچے روتے چلاتے ہیں، لوگ باہر لگے نلکے پر ایک دوسرے کو دھکے دیتے ہیں اور کچھ بچے پتیلیوں میں سے رات کا بچا ہوا دلیہ کھرچ کھرچ کر کھا رہے ہوتے ہیں، میں اور میرا بڑا بھائی اپنے جوتے پالش کرتے ہیں۔ دادی ہمیں ٹانگیں سیدھی کر کے چٹائی پر بٹھا دیتی ہے اور ہمارے جوتوں کا غور سے معائنہ کرتی ہے کہ ہم نے ٹھیک پالش کیے ہیں یا نہیں۔ خیمے میں اور کسی بھی بچے کے پاس اسکول کے سچ مچ کے جوتے نہیں ہیں۔ جب ہم تینوں ان جوتوں کو دیکھتے ہیں تو ہمیں لگتا ہے ہم اپنے گھر میں ہیں، نہ کہیں جنگ ہو رہی ہے اور نہ ہم کسی اور جگہ چلے گئے ہیں۔

کچھ گورے لوگ خیمے میں رہنے والے ہمارے لوگوں کی تصویریں اتارنے آئے ــــ وہ کہتے تھے کہ وہ فلم بنا رہے ہیں۔ میں نے کبھی فلم نہیں دیکھی حالاں کہ مجھے اس کے بارے میں شدھ بدھ ہے۔ ایک گوری عورت ہماری جگہ میں گھس آئی اور دادی سے سوال کرنے لگی جسے ایک آدمی، جو اُس عورت کی زبان سمجھتا تھا، ہماری زبان میں دُہراتا۔

"یہاں کب سے اسی طرح رہ رہی ہو؟"

"کیا مطلب؟ یہاں؟" دادی نے کہا۔ "اس خیمے میں؟ دو سال اور ایک ماہ سے۔"

"اور مستقبل کے بارے میں تمھاری کیا امیدیں ہیں؟"

"کچھ بھی نہیں۔ میں بس یہیں ہوں۔"

"لیکن تمھارے بچے؟"

''میں چاہتی ہوں وہ پڑھ لکھ جائیں تاکہ انھیں اچھی نوکری اور اچھے پیسے مل سکیں۔''

''کیا تمھیں امید ہے کہ تم اپنے ملک واپس جا سکو گی؟''

''میں واپس نہیں جاؤں گی۔''

''لیکن آخر جب جنگ ختم ہو جائے گی تب تو تمھیں یہاں رہنے کی اجازت نہ ہو گی۔ کیا تم اپنے گھر واپس نہیں جانا چاہتیں؟''

مجھے لگا جیسے اب دادی کچھ اور کہنا نہیں چاہتی۔ میرا خیال تھا وہ گوری عورت کے سوال کا جواب نہیں دے گی۔ گوری عورت نے اپنی گردن موڑ کر ہماری طرف دیکھا اور مسکرائی۔

دادی نے اس کی طرف سے منھ پھیر لیا اور بولی، ''اب کچھ بھی نہیں رہا۔ کوئی گھر نہیں۔''

دادی نے ایسا کیوں کہا؟ آخر کیوں؟ میں تو واپس جاؤں گی۔ میں اسی کروگر پارک سے گزر کر واپس جاؤں گی۔ جنگ کے بعد، اگر سب ڈاکوؤں کا صفایا ہو گیا تو۔ شاید ہماری اماں وہاں ہمارا انتظار کر رہی ہو۔ اور شاید ہمارے دادا نے، جسے ہم پیچھے چھوڑ آئے تھے، راستہ ڈھونڈھ لیا ہو اور شاید وہ آہستہ آہستہ کروگر پارک سے ہوتا ہوا گھر واپس پہنچ گیا ہو! وہ سب تو گھر میں ہوں گے، اور میں کیا انھیں یہاں بیٹھی بس یاد ہی کرتی رہوں گی؟

کتب خانہ پیپربیک سیریز

آٹھ کتابوں پر مشتمل پہلا سیٹ

لالٹین اور دوسری کہانیاں
محمد خالد اختر

قیمت: ۱۱۰ روپے

طاؤس چمن کی مینا
نیر مسعود

کہانیاں

قیمت: ۹۰ روپے

شہنشاہ
ریشارد کاپو ِشنسکی

پولش ادیب اور صحافی کے قلم سے

ایرانی شاہی اور انقلاب کی کہانی

قیمت: ۶۵ روپے

غصے کی نئی فصل
اسد محمد خاں

کہانیاں

قیمت: ۹۰ روپے

بوف کور
صادق ہدایت

معروف فارسی ناول کا ترجمہ

قیمت: ۴۰ روپے

سوئی بھوک
حسن منظر

کہانیاں

قیمت: ۹۰ روپے

رات
سعید الدین

نظمیں

قیمت: ۵۰ روپے

جوابِ دوست
نسیم انصاری

ایک نامور ہندوستانی مسلمان کی یادداشتیں

قیمت: ۶۵ روپے

پورے سیٹ کی قیمت: ۴۰۰ روپے

میرا جی

مشرق و مغرب کے نغمے

(زیرِ طبع)

***

کبیر

کبیر بانی

(زیرِ طبع)

***

میرا بائی

پریم وانی

(زیرِ طبع)

آج کی کتابیں

نکہت حسن

عاقبت کا توشہ

یہ نکہت حسن کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ یہ کہانیاں اردو کے معروف ادبی رسالوں "سویرا"، "فنون"، "نیادور"، "نصرت"، "سیپ" اور "آج" میں شائع ہو چکی ہیں۔ نکہت حسن اتر پردیش کے ضلع بلند شہر کے ایک قصبے سکندر آباد میں پیدا ہوئیں۔ انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے گرلز کالج، کراچی کے سینٹ جوزف کالج اور پھر کراچی یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کی۔ ان کے ادبی سفر کا آغاز ۱۹۶۰ کی دہائی میں ہوا۔ اس مجموعے میں ان کی اب تک کی تقریباً تمام کہانیاں شامل ہیں۔ ان کا سفرنامہ "عذاب دانش" کتابی صورت میں شائع ہونے والا ہے۔ اس میں جرمنی کے سفر کے تاثرات تحریر کیے گئے ہیں۔

Cover painting: Meher Afroz

آج
کتب خانہ
پیپر بیک سیریز

ISBN 969-8379-16-9
Rs. 85